رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ
اپریل ۲۰۲۴ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

## ڈاکٹر اسرار احمدؒ
## قرآن میں رچی بسی شخصیت

شاہ اجمل فاروق ندوی


داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیان القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

❁ امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مرا کو جلد ❁ 1248 صفحات

-/4500 روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں

رمضان المبارک کا خصوصی تحفہ

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!


جلد : 73

شمارہ : 4

رمضان المبارک۔شوال المکرم 1445ھ

اپریل 2024ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون : 500روپے


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ


مدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق



مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




# مشمولات


**عرضِ احوال** 5

رمضان المبارک اور قیامِ پاکستان — ایوب بیگ مرزا

**بیانُ القُرآن** 9

سورۃ الانشقاق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**یادِ رفتگاں** 21

ڈاکٹر اسرار احمدؒ: قرآن میں رچی بسی شخصیت — شاہ اجمل فاروق ندوی

**تعمیرِ سیرت** 27

روزہ اور تزکیۂ نفس — مولانا عبدالمتین

**پیامِ اقبال** 34

مثنوی "پس چہ باید کرد"

میں اقبالؒ کا اُمّت کے لیے پیغام — ارسلان اللہ خان

**حکمتِ قرآنی** 39

لقمان حکیم کی وصیتیں (۴) — مقصود الحسن فیضی

**اقبالیات** 55

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی اہمیت — علیزہ عبدالقادر نظامانی

**تحریکِ جماعت اسلامی** 63

اسلامی نظام بذریعہ انتخابات

مولانا مودودیؒ کے موقف میں تبدیلی — سعادت محمود

**دعوتِ فکر** 80

ایک فکر انگیز پکار — سید ابوالحسن علی ندویؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# رمضان المبارک اور قیامِ پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی نصف شب جب مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز ریڈیو سے گونجی کہ ’’یہ ریڈیو پاکستان ہے‘‘ تو رمضان المبارک کی ۲۷ ویں شب تھی جس کے بارے میں گمانِ غالب ہے کہ وہ لیلۃ القدر ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ حسنِ اتفاق ہوسکتا ہے لیکن ہم اسے خالصتاً مشیتِ ایزدی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ یہ ثابت کر چکی تھی کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے لیکن پھر بھی ۱۹۴۷ء کے آغاز میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان اسی سال دنیا کے نقشہ پر ایک حقیقت بن کر اُبھر سکے گی۔ انگریز حاکموں اور برصغیر کی اکثریتی قوم ہندو کی شدید ترین مخالفت کے باوجود اس کا قائم ہوجانا ہی کچھ ناقابلِ فہم سا محسوس ہوتا تھا‘ لیکن تشکیل پاکستان کے تاریخی واقعات کو مرحلہ وار دیکھیں تو اُس سال ستائیس رمضان المبارک کی نصف شب کے قریب قیام پاکستان کا اعلان واقعتاً کُنۡ فَیَکُوۡن کا مظہر محسوس ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور میں پاکستان کا ذکر نہیں تھا بلکہ اس میں آزاد مسلمان ریاستوں کا ذکر ہے۔ اس پس منظر میں ایک ہزار میل سے زائد زمینی فصل رکھنے والے دو حصوں پر مشتمل ایک ریاست کا قائم ہوجانا معجزہ محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کو بجا طور پر مملکت خداداد کہا جاتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان بنا کر ہندوؤں سے ہزار سالہ رفاقت ختم کی‘ ان کی دشمنی مول لی۔ نتیجہ کے طور پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں لاکھوں مسلمان بے گھر ہوئے‘ بے شمار قتل ہوئے اور اَن گنت مسلم خواتین کی بے حرمتی ہوئی‘ یعنی پاکستان پر جان‘ مال اور عزّت جو انسان کا کُل سرمایہ ہوتا ہے‘ سب کچھ لٹا دیا گیا۔ ’’پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ‘‘ اتنا پُرکشش نعرہ تھا اور نظریۂ پاکستان کی اصطلاح اتنی دل پزیر تھی کہ یہ قربانیاں حقیر محسوس ہوتی تھیں۔

نظریۂ پاکستان یعنی اسلام کے یوں تو دو بنیادی ماخذ ہیں: قرآن اور حدیث‘ لیکن یہ دو بھی اس طرح اکائی بن جاتے ہیں کہ حضور ﷺ قرآنِ مجسّم اور قرآنِ ناطق بھی تو کہلاتے ہیں۔



حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک حدیث کے مطابق قرآن سیرتِ رسول ﷺ اور خُلقِ رسول ﷺ ہی کا تو بیان ہے۔ یعنی قرآن دین متین کا اصل منبع‘ سرچشمہ اور ماخذ ہے۔ لہٰذا نظریۂ پاکستان کی آبیاری کے لیے پاکستان میں جو پہلا کام ہونا چاہیے تھا‘ وہ یہ تھا کہ قرآن کی تعلیم کو عام کیا جاتا‘ قرآن کی زبان کو سیکھا اور سکھایا جاتا۔ آخر انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی جاسکتی ہے تو قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے عربی کیوں نہیں سیکھی جاسکتی تھی؟ اگرچہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اسے سمجھے بغیر بھی پڑھا جائے تو بھی ایک لطف‘ سرور اور کیف محسوس ہوتا ہے‘ لیکن عملی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے احکامِ قرآنی کو اپنا امام بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے اوامر پر عمل کیا جاتا اور اس کے نواہی سے رُکا جاتا۔ لیکن صد افسوس کہ عوامی اور حکومتی دونوں سطحوں پر عملی زندگی سے اسلام کو خارج کر دیا گیا۔ ہم مصنوعی روشنیوں کے ذریعے عزّت و وقار کا راستہ ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ فطری روشنی کے مینار قرآن مجید پر ریشمی جُزدانوں کے بے شمار غلاف چڑھا دیے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر کوشاں ہیں کہ حق کو دبیز ریشمی پردوں میں چھپا دیا جائے۔ نتیجتاً ہم صراطِ مستقیم سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ اسلام کے عادلانہ نظام کو اپنانا تو دُور کی بات ہے‘ ہم عام انسانی اخلاقیات سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ رمضان اور قرآن کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان نے کیا سلوک کیا‘ یہ ایک دل فگار کہانی ہے۔ رمضان کو تاجروں‘ ذخیرہ اندوزوں اور صنعت کاروں نے لوٹ کھسوٹ اور چور بازاری کا مہینہ بنا لیا۔ اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیں تو ظلم‘ ناانصافی‘ کرپشن‘ خیانت‘ جھوٹ‘ بددیانتی اور منافقت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا۔ سیاسی اور معاشی سطح پر ہماری کوئی کل سیدھی نہیں۔ بیرون ملک ہماری پہچان ایک بھکاری ملک کی ہے۔ دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے طبقاتی خلیج کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو نزلہ و زکام کے علاج کے لیے یورپ میں ہسپتال بک کرواتے ہیں اور اپنے کتوں کے لیے ایئر کنڈیشنڈ کمرے تعمیر کرواتے ہیں جبکہ دوسری جانب ایک ایسا طبقہ ہے جو بھوک اور بیماری کے ہاتھوں رسی باندھ کر چھت سے جھول جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حال ہی میں وجود میں لائی جانے والی حکومت اپریل ۲۰۲۲ء کے بعد ملک میں مسلّط کی گئی پی ڈی ایم اور اُس کے بعد کے نگرانوں ہی کا تسلسل ہے۔ موجودہ جوڑ توڑ والی حکومت کے پشت پناہ تک وہی ہیں۔ ہماری سیاست‘ معیشت اور معاشرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سرِ عام بغاوت کا اعلان کر رہی ہے۔ سود کو قرآن مجید نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے

خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا مگر ہماری معیشت کی پوری عمارت ہی اسی بنیاد پر کھڑی ہے۔ رہی سہی کسر اب ظاہری اور اصل حکمرانوں کی جانب سے محمد اورنگ زیب کی بطور وزیر خزانہ تعیناتی سے پوری ہوگئی ہے جنہیں آج بھی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ معاشرے میں فحاشی‘ بے حیائی‘ جھوٹ‘ کرپشن اور لوٹ مار کا دور دورہ ہے۔ ہمارا پورے کا پورا سیاسی اور حکومتی نظام اسلام کے بنیادی اصولوں کو چیلنج کرتا ہوا سیکولرازم اور لبرل ازم کی طرف جا رہا ہے‘ حالانکہ یہ ملک اس وعدے پر حاصل کیا گیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کو نافذ کریں گے۔ بجائے اس کے‘ اسلام کے لیے یہ دھرتی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

قِصّہ مختصر‘ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہم بندگلی میں داخل ہو چکے ہیں لیکن مایوسی کفر ہے۔ ضرورت ہے واپس لوٹنے کی‘ قرآن کی طرف رجوع کرنے کی جو نسخہ کیمیا ہے۔ اسی میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ ہمیں ماضی سے بھی آگاہ کرتا ہے اور مستقبل کے لیے رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔ رمضان کا بابرکت مہینہ ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہماری ذلّت و رسوائی کی اصل وجہ کیا ہے! ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اسلامی ممالک میں سے صرف پاکستان ہی نے قرآن حکیم سے اعراض کیا ہے اور اسے پس پشت ڈالا ہے جس کے نتیجہ میں یہ اس حال کو پہنچا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان واحد اسلامی ملک ہے جس کے قیام کا جواز اسلام بتایا گیا تھا۔ کسی اور ملک نے اپنے نام کا مطلب ’’لا الٰہ الّا اللہ‘‘ نہیں بتایا تھا۔ علاوہ ازیں اگر دوسرے اسلامی ممالک نے بھی قرآن کو ترک کیا ہے تو کون سی دنیا میں عزت کمائی ہے! آج پوری دنیا میں ایک اسلامی ملک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا دعویٰ کر سکے اور وقت کی سپر پاور سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ اسرائیل غزہ کے مسلمانوں پر بدترین اور غیر انسانی ظلم و ستم ڈھا رہا ہے‘ مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ رہا ہے اور بوڑھوں‘ عورتوں‘ بچوں اور جوانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل رہا ہے‘ لیکن ۵۷ اسلامی ممالک ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔ اسرائیل‘ امریکہ اور دیگر اسلام دشمن قوتوں کا ہاتھ صرف اور صرف ایک اسلامی فلاحی ریاست روک سکتی ہے۔ ہر کلمہ گو کا اوّلین دینی فریضہ ہے کہ مذکورہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے تن من دھن لگا دے۔ یہی حالات کا تقاضا ہے‘ یہی کرنے کا اصل کام ہے‘ یہی جہاد ہے۔ اِسی غرض کو پورا کرنے کے لیے اگر بات جان کا نذرانہ پیش کرنے تک پہنچے تو جان ہتھیلیوں پر رکھ کر نکلنا ہوگا۔

پندرہ سو سال قبل مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست چند



سالوں میں اگر یورپ‘ ایشیا اور شمالی افریقہ تک پھیل گئی تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے قرآن کو اپنا امام بنا کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی راہیں متعین کی تھیں۔ آج اگر اسلام کے نام پر بننے والی دوسری ریاست پاکستان ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہے تو اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے قرآن سے حقیقی اور عملی تعلق منقطع کر لیا ہے۔ ہم اگر رمضان کی حقیقی برکات سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن کو اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا۔

اے کاش! رمضان میں جنم لینے والا پاکستان قرآن کی عملی تعبیر نظر آئے۔ اے کاش! رمضان کے روزے ہمیں ایسی توانائی بخش دیں کہ ہم موجود باطل نظام کا سر کچل سکیں جس نے دنیا میں ہمیں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا اور ہماری اُخروی فلاح بھی مشکوک کر دی ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ آج مسلمانانِ پاکستان جتنا قرآن پڑھتے ہیں‘ آج جتنے بچے قرآن حفظ کر رہے ہیں اِس حوالہ سے ماضی قریب کی نسبت ہماری صورتِ حال بہت بہتر ہے‘ پھر ہماری یہ ذلت و رسوائی کیوں؟ یقیناً یہ بات درست ہے کہ تلاوتِ قرآن اور حفظِ قرآن میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے فائدے سے ہم محروم نہیں رہیں گے۔ اس کے روحانی اثرات مرتب ہونے کے بھی ہم مکمل طور پر قائل ہیں۔ البتہ ایک مثال جو اگرچہ پوری طرح تو منطبق نہیں ہوتی لیکن صرف متوجہ کرنے کے لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ کیا کبھی کسی مریض کو ڈاکٹر کا نسخہ صرف پڑھ لینے سے یا دوائیوں کے نام رٹ لینے سے افاقہ ہوا ہے؟ اس سے صرف اُس کے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے کہ اس مرض کے لیے یہ دوائیاں کارآمد ہیں۔ اسی طرح جب تک ہم اپنی عملی زندگی میں قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کریں گے اور اس کتابِ ہدایت کو اپنے دل و دماغ میں انڈیل نہیں لیں گے‘ اس کے حکم پر آگے نہیں بڑھیں گے اور جس سے روک دے گا اس سے رک نہیں جائیں گے‘ کسی قسم کے لیت و لعل میں اور کسی قسم کی دلیل بازی میں نہیں پڑیں گے تب تک ہم قرآن پاک سے حقیقی اور مکمل فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی ہم حاملِ قرآن ہونے کے دعویٰ میں سچے ہوں گے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جسے افشا ہوئے پندرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ مسئلہ ہماری بیداری کا ہے‘ مسئلہ ہماری نیت کا ہے اور مسئلہ صرف عمل کا نہیں ضعفِ ایمان کا بھی ہے۔ آخر میں علامہ اقبال کا یہ شعر عرض کیے دیتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا
الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَ حُقَّتْ ۙ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا
فَمُلٰقِیْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ
حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ
اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ یَصْلٰى
سَعِیْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ
یَّحُوْرَ ۛ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ؕ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ
بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ
طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ
الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُكَذِّبُوْنَ ۚ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ ۚ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

**آیت ۱** ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾﴾ ’’جب آسمان پھٹ جائے گا۔‘‘

نوٹ کیجیے! ان تمام سورتوں کا بنیادی موضوع ’’تذکیرِ آخرت‘‘ ہے۔

**آیت ۲** ﴿وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۲﴾﴾ ’’اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے



یہی زیب دیتا ہے۔‘‘

اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا کہ وہ اپنے رب کے حکم پر کان لگائے ہوئے ہے اور جو بات کان لگا کر سنی جائے اس کے مطابق عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اَذِنَتْ کا معنی اِسْتَمَعَتْ وَانْقَادَتْ کیا گیا ہے‘ یعنی اُس نے غور سے سنا اور تعمیل کی۔ حُقَّتْ یہاں مجہول ہے حَقَّ یَحِقُّ سے۔ یعنی وہ اسی لائق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اپنے خالق کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے۔

**آیت ۳** ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾﴾ ’’اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔‘‘

**آیت ۴** ﴿وَاَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾﴾ ’’اور وہ نکال باہر کرے گی جو کچھ اس کے اندر تھا اور خالی ہو جائے گی۔‘‘

سورۃ الزلزال میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾﴾ ’’اور جب زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر پھینک دے گی‘‘۔ قیامت کے دن زمین اپنے اندر مدفون تمام انسانوں کے اجسام اور ان کے تمام اجزاء کو نکال باہر کرے گی۔ اس کے علاوہ بھی زمین میں جو کچھ معدنیات اور خزانے مخفی ہیں وہ قیامت کے دن نکال کر باہر پھینک دے گی۔

**آیت ۵** ﴿وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۵﴾﴾ ’’اور وہ بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اسے یہی زیب دیتا ہے۔‘‘

جس طرح اطاعت و انقیاد کا مظاہرہ آسمان کرے گا‘ اسی طرح زمین بھی حکم الٰہی بجا لائے گی۔

**آیت ۶** ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۚ﴿۶﴾﴾ ’’اے انسان! تُو مشقّت پر مشقّت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف‘ پھر تُو اس سے ملنے والا ہے۔‘‘

یہ دنیا انسان کے لیے دار المحن یعنی مشقتوں کا گھر ہے۔ انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سورۃ البلد میں یوں بیان فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾﴾ کہ انسان تو پیدا ہی مشقّت میں کیا گیا ہے۔ گویا مشقتیں برداشت کرنا‘ دکھ اٹھانا اور سختیاں جھیلنا انسان کا

مقدر ہے۔ اس سے کسی انسان کو رستگاری نہیں۔ مزدور ہے تو وہ صبح سے شام تک جسمانی سختیاں سہہ رہا ہے۔ کارخانہ دار ہے تو انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں جگر خون کر رہا ہے۔ اگر کوئی کسی دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو ذہنی مشقت کی چکی میں پس رہا ہے۔ پھر اپنی اور اہل وعیال کی بیماریاں‘ معاشی مشکلات‘ معاشرتی الجھنیں‘ مال و جان کی حفاظت کی فکر وغیرہ کی صورت میں ذہنی ونفسیاتی پریشانیاں الگ ہیں جو ہر انسان کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کا غم اس کے علاوہ ہے جو ہر انسان نے اپنے دل و دماغ میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور پال رکھا ہے۔ پیدل چلنے والا سائیکل سوار کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے‘ سائیکل سوار کار والے کے حسد میں مبتلا ہے۔ چھوٹی کار والا بڑی کار والے سے جلن کا شکار ہے۔ غرض مشقت‘ تکلیف یا غم کی نوعیت تو مختلف ہوسکتی ہے مگر کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی دکھ‘ پریشانی یا مشقت میں مبتلا نہ ہو۔ ان مشقتوں‘ تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا انسان کو روزِ اوّل سے ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ جیتے جی کوئی انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔ مرزا غالبؔ نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے: ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ‘ لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر اور پریشان کن ہے۔ اور وہ مسئلہ ہے کہ: ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

انسان کے اخروی احتساب کا تصور ذہن میں لائیں اور پھر موازنہ کریں کہ باقی جانداروں کے مقابلے میں ’’انسان‘‘ کس قدر مشکل میں ہے۔ ایک بار بردار جانور کی زندگی کا معمول چاہے جتنا بھی مشکل ہو لیکن اس کی مشقت اور تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایک بیل جب ہل یا رہٹ چلاتے چلاتے مرجاتا ہے تو اس مشقت سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک انسان ہے جو کوفت پر کوفت برداشت کرتا اور تکلیف پر تکلیف جھیلتا جب اس دنیا سے جائے گا تو اسے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی دنیوی



زندگی کے ایک ایک پل کا حساب دینا ہوگا۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ ، وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ))[1]

’’ابن آدم کے پاؤں قیامت کے روز اپنے رب کے حضور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں فنا کی؟ اس کی جوانی (کی قوتوں‘ صلاحیتوں اور اُمنگوں) کے دور کے بارے میں کہ کیسے گزارا؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (حلال ذرائع سے کمایا یا حرام طریقے سے اور اللوں تللوں میں خرچ کیا یا ادائے حقوق کے لیے؟) اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟‘‘

یعنی دنیا میں بار برداری بھی کرو‘ جسمانی‘ ذہنی اور نفسیاتی اذیتیں بھی برداشت کرو۔ مال و جان اور اولاد سے متعلق رنگا رنگ صدمے جھیلتے جھیلتے زندگی بھر کانٹوں پر بھی لوٹتے رہو اور پھر مرنے کے بعد ایک ایسی ہستی کے سامنے کھڑے ہو کر پل پل کا حساب بھی دو جس سے تمہارے قلوب واذہان کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے جذبات وخیالات بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ ہے ’’انسان‘‘ کی اصل ٹریجڈی!

یہ مرحلہ ایک انسان کے لیے ایسا مشکل ہے کہ اسے یاد کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایک چڑیا ہوتا!

دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے درج بالا فرمان میں مذکور سوالات میں سے آخری سوال سب سے مشکل ہے۔ جس کسی نے دین اور قرآن کا علم جس قدر زیادہ سیکھا اس کے لیے اس کا حساب دینا اسی قدر مشکل ہوگا۔ اگر کسی انسان تک قرآن کی یہ دعوت پہنچ ہی نہیں پائی تو ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ (ایسی صورت میں اس کوتاہی کا کچھ نہ کچھ بوجھ ان لوگوں پر بھی ضرور پڑے گا جنہوں نے اسے دعوت پہنچانے میں تساہل برتا) لیکن جن لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق قرآن کے پیغام کو سمجھ بھی لیا تو

---

۱۔ سنن الترمذی‘ کتاب صفة القيامة والرقائق والورع‘ باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔ ح: ۲۴۱۶۔ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

ظاہر ہے ان کے لیے اس آخری سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

**آیت ۷** ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ۝۷﴾ ’’تو جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں۔‘‘

**آیت ۸** ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ۝۸﴾ ’’تو اس سے لیا جائے گا بہت ہی آسان حساب۔‘‘

اس حساب کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی وضاحت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ بخاری و مسلم کی اس حدیث میں آئی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ حُوْسِبَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عُذِّبَ)) ’’قیامت کے روز جس کا حساب لیا جائے گا اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا‘‘۔ اس پر میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ۝﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَیْسَ ذَاكِ الْحِسَابُ، اِنَّمَا ذَاكِ الْعَرْضُ، مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عُذِّبَ))[۲] ’’یہ حساب نہیں ہوگا‘ یہ تو محض (اعمال نامہ) پیش کیا جانا ہوگا‘ روزِ قیامت جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اُسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔‘‘

یعنی جس خوش قسمت انسان کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا‘ اس سے نہ تو کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی اس کے مواخذے اور مناقشے کی نوبت آئے گی۔ بس اس کے اعمال نامے کو ایک نظر دیکھ کر اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص سے نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!)

**آیت ۹** ﴿وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ۝۹﴾ ’’اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں۔‘‘

عدالت کے کٹہرے سے وہ شخص جب اپنے ان اہل و عیال‘ رشتہ دار اور ساتھیوں کی طرف واپس لوٹے گا جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے تو بہت خوش ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت

۲۔ صحیح البخاری‘ کتاب العلم‘ باب من سمع شیئا فلم یفهمه ... ح:۱۰۳۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها‘ باب اثبات الحساب‘ ح:۲۸۷۶ واللفظ له۔



سے میری بھی خلاصی ہوگئی۔

**آیت ۱۰** ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ۝۱۰﴾ ’’اور جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے۔‘‘

قرآن کریم کی اکثر آیات میں ایسے لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سیاق و سباق میں یہاں وَرَآءَ ظَهْرِهٖ کے الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ فرشتہ ایک مجرم شخص کو جب اس کا اعمال نامہ پکڑانے لگے گا تو وہ اس سے بچنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اپنی کمر کے پیچھے چھپا لے گا۔ چنانچہ اسی حالت میں اعمال نامہ پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

**آیت ۱۱** ﴿فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ۝۱۱﴾ ’’تو اب وہ موت کی طلب کرے گا۔‘‘

اُس وقت اُس کی ایک ہی خواہش ہوگی کہ مجھے موت آ جائے اور میں مر کر ختم ہو جاؤں۔

**آیت ۱۲** ﴿وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ۙ۝۱۲﴾ ’’لیکن وہ داخل ہوگا جہنّم میں۔‘‘

**آیت ۱۳** ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۙ۝۱۳﴾ ’’یقیناً (دنیا میں) وہ اپنے اہل و عیال میں بہت خوش و خرم تھا۔‘‘

دنیا میں وہ حرام کی کمائی سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش کرتا رہا اور آخرت کے محاسبے کا کبھی تصوّر بھی ذہن میں نہ لایا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی شخص اپنی روزی تو سو فیصد حلال ذرائع سے کما رہا ہے لیکن وہ اللہ کے دین کا حق ادا نہیں کر رہا تو ایسے شخص کی حلال ذرائع سے کمائی ہوئی وہ روزی بھی حلال نہیں۔ اس لیے کہ اُس نے اپنی روزی کمانے کی اس تگ و دو میں جو وقت‘ صلاحیتیں اور وسائل صَرف کیے ہیں ان میں دین کے حقوق کا حصّہ بھی شامل تھا۔ گویا اپنے وقت‘ وسائل اور اپنی صلاحیتوں کا وہ حصّہ جو اُسے اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا چاہیے تھا اس حصّے کو غصب کر کے وہ اپنے ذاتی استعمال میں لے آیا ہے۔ تو دین کے حقوق کو غصب کر کے کمائی ہوئی ایسی روزی حلال کیسے ہو سکتی ہے؟ دراصل حلال و حرام کے معاملے کو بہت دِقّتِ نظری سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس معاملے کو عام طور پر بہت سطحی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام مسلمان سؤر کا گوشت کھانے کا تو تصوّر بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اس بکری کا گوشت بہت مزے اور رغبت سے کھا لیتا ہے جو اُس نے کسی کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر خریدی ہوتی ہے۔ اب ایسی بکری کے بارے میں کون کہے گا کہ وہ

حلال ہے اور حرام نہیں ہے!

اس موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باطل کے غلبے کے تحت اطمینان و سکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی جِدّ و جُہد نہیں کر رہا تو وہ بزعم خویش بے شک ناپ تول کر حلال ہی کیوں نہ کھا رہا ہو‘ اُس کا کھانا پینا حتیٰ کہ اس ماحول میں سانس لینا سب حرام ہے۔ ایسے شخص کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کس نظام کی چاکری کر رہا ہے؟ کس کے اقتدار کو کندھا دے رہا ہے؟ تنخواہ کہاں سے لے رہا ہے؟ اور اپنا کاروبار کس کی مدد سے آگے بڑھا رہا ہے؟ ظاہر ہے وہ یہ سب کچھ باطل نظام کے لیے کر رہا ہے اور طاغوت کی فراہم کردہ چھتری کے سائے میں کر رہا ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کا کسی باطل نظام کے تحت ہنسی خوشی زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ اِلا یہ کہ ایسی صورتِ حال میں وہ کراہت اور بے چینی میں زندگی بسر کرے‘ اپنی ضروریات کو کم سے کم سطح پر رکھے اور باطل نظام کو بدلنے کے لیے اپنا تن من دھن کھپا دینے پر ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی یہ سوچ اور جدّ و جُہد باطل نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے گناہ کا کفّارہ بن جائے گی۔

آیات زیر مطالعہ میں دو انسانی کرداروں کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں ایک کردار تو اللہ کے اُس بندے کا ہے جو دُنیوی زندگی کے دوران آخرت کی جواب طلبی کے احساس سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب پر آخرت کے احتساب کا خوف اس حد تک مسلط ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس کیفیت کو جنّت میں پہنچ کر بھی یاد کریں گے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ (الطور) ’’وہ کہیں گے کہ ہم پہلے (دنیا میں) اپنے اہل و عیال میں ڈرے ہوئے رہتے تھے‘‘۔ ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں یہاں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عدالت سے اپنی کامیابی کی نوید سننے کے بعد اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں لوٹے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کردار وہ ہے جو آخرت اور آخرت کے محاسبے سے بے خبر اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت میں مست رہا۔ ایسے شخص نے دنیا میں بلاشبہ ایک خوشحال اور خوشیوں بھری زندگی گزاری‘ لیکن آخرت میں اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

**آیت ۱۴** ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝۱۴﴾ ’’اُسے گمان ہو گیا تھا کہ کبھی لوٹ کر نہیں آنا ہے۔‘‘



**آیت ۱۵** ﴿بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝۱۵﴾ ’’کیوں نہیں! یقیناً اُس کا ربّ تو اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔‘‘

اگلی تین آیات میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اپنے مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے یہ آیات سورۃ المدثر کی ان آیات کے ساتھ خاص مناسبت اور بہت گہری مشابہت رکھتی ہیں: ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝۳۲ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝۳۳ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝۳۴﴾ ’’کیوں نہیں‘ قسم ہے چاند کی۔ اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔ اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے‘‘۔ ان دونوں مقامات کے مابین ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قسموں پر مشتمل مذکورہ آیات سے بالکل نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر میں بھی ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝۳۲﴾ سے ایک نئے مضمون کا آغاز ہو رہا ہے اور بالکل ایسی ہی صورتِ حال زیر مطالعہ سورت کے اس مقام پر بھی نظر آتی ہے۔

**آیت ۱۶** ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۶﴾ ’’تو نہیں‘ مجھے قسم ہے شام کی سرخی کی۔‘‘

**آیت ۱۷** ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝۱۷﴾ ’’اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے۔‘‘

**آیت ۱۸** ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝۱۸﴾ ’’اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔‘‘

میری خالص ذاتی رائے کے مطابق (واللہ اعلم!) سورۃ المدثر کی مذکورہ آیات (۳۲‘ ۳۳‘ ۳۴) میں بعثتِ محمدی ﷺ کی خبر دی گئی ہے‘ جبکہ زیر مطالعہ آیات میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ المدثر کے مطالعے کے دوران اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ رات ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝۳۳﴾ سے مراد چھ سو سال (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور تک) کا وہ طویل عرصہ ہے جس کے دوران وحی و نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور دُنیا پر مجموعی طور پر کفر و شرک اور ضلالت و جہالت کے اندھیرے چھائے رہے۔ چاند کی قسم ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝۳۲﴾ میں علم و ہدایت کی اس مدھم روشنی کا استعارہ ہے جو جن و اِنس کے نیک افراد کی صورت میں اس دوران کہیں کہیں موجود رہی‘ جبکہ صبح کی قسم ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝۳۴﴾ کے پردے میں نبوتِ محمدی ﷺ کے خورشید کے طلوع ہونے کی خبر دی گئی ہے‘ اور اس کے بارے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے: ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى

الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ کہ یہ بلاشبہ ایک بہت عظیم واقعہ ہے۔ظاہر ہے نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبوتِ محمدی ﷺ کے ظہور سے بڑا کوئی اور واقعہ کیا ہوگا۔

بہرحال نبوت ورسالتِ محمدی ﷺ کے خورشیدِ جہاں تاب کی تابانیوں سے چھ سو سال کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔حضور ﷺ کی وساطت سے اَبنائے آدم کو ''اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' کی خصوصی سند بھی عطا ہوئی' جزیرہ نمائے عرب میں انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب بھی رونما ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انقلاب کی فتوحات وبرکات تین براعظموں تک پھیل گئیں۔لیکن چند ہی دہائیوں کے بعد مشیتِ خداوندی سے نہ صرف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے' بلکہ رفتہ رفتہ وہ پسپائی پر مجبور ہوگئے۔ پسپائی کا یہ عمل جب شروع ہوا تو صرف جنگی محاذوں سے پیچھے ہٹنے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمان بحیثیت قوم زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان سے دست بردار ہوکر نکبت وادبار کی پستیوں میں لڑھکتے چلے گئے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور ابھی اس کے رکنے کے بظاہر کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ یہ گمبھیر صورتِ حال اپنی جگہ پر ایک زمینی حقیقت ہے' لیکن دوسری طرف ہمارا ایمان ہے کہ قیامت سے پہلے اسلام پوری دنیا پر غالب آئے گا۔اس بارے میں حضور ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں (اس مضمون کی احادیث ''نویدِ خلافت'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں جمع کر دی گئی ہیں۔تفصیل جاننے کے لیے اس کتابچے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے)۔میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ مطالعہ آیات میں اسلام کے اسی غلبے کی بشارت دی گئی ہے جس کی تفصیل حضور ﷺ کے فرمودات میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک یہاں پہلی قسم ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾﴾ میں اسلام کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے کی صورتِ حال کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔یعنی سورج غروب ہو چکا ہے اور اب اُفق پر صرف شفق کی سرخی نظر آ رہی ہے۔دوسری قسم ﴿وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾﴾ میں حالات کے مزید گمبھیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ دین پر عمل کے اعتبار سے دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا جائے گی' صرف مدھم سی روشنی باقی رہے گی جو وقت آنے پر آہستہ آہستہ بڑھتی جائے گی۔درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے چاند کی قسم ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾﴾ اسی مدھم اور تدریجاً بڑھتی ہوئی روشنی کا استعارہ ہے۔ظاہر ہے جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کی چاندنی ایک حد تک رات کو روشن کر دیتی ہے۔اس کے بعد فرمایا:



**آیت ۱۹** ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾﴾ ''(اسی طرح) تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔''

یعنی جس طرح چاند درجہ بدرجہ بڑا ہو کر مرحلہ وار رات کو روشن کرتا ہے بالکل اسی طرح تم مرحلہ وار کوششوں سے غلبۂ دین کی منزل تک پہنچو گے۔واضح رہے کہ لَتَرْکَبُنَّ کے صیغے میں زور اور تاکید بھی ہے کہ تم لوگ اس منزل تک ضرور پہنچو گے۔ظاہر ہے ہمیں یہ خبر محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے وَھُوَ الصَّادِقُ وَالْمَصْدُوْق! آپؐ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہوسکتی۔لہٰذا دنیا پر اسلام کا مکمل غلبہ ہو کر رہے گا۔البتہ اسلام کے پہلے غلبے کی شان اور تھی اور دوسرے غلبے کا انداز اور ہوگا۔یہ فرق سورۃ المدثر کی آیت ۳۴ اور زیرِ مطالعہ سورت کی آیت ۱۸ پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔یعنی اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صبح کے اُجالے کی طرح ہوا تھا: ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾﴾ (المدثر)۔اس اُجالے کی شان یہ تھی کہ ادھر آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہوگیا۔یعنی حضور ﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف تیئیس (۲۳) برس کے مختصر عرصے میں تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام پوری طرح غالب آ گیا۔ظاہر ہے سورج کے طلوع ہونے کے بعد روشنی ہونے میں زیادہ دیر تو نہیں لگتی۔

البتہ اسلام کے دوسرے غلبہ کی روشنی چاند کی چاندنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔یعنی اب اقامتِ دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی کوششوں اور کسی ایک نسل کے زمانے میں نہیں بلکہ نسل در نسل جِدّوجُہد سے قائم ہوگا۔جیسے برعظیم پاک وہند میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''یعنی مسلمان اس ضابطہ حیات کو ایک ''وحدت'' کے طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنے کے لیے جِدّوجُہد کریں۔پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حزب اللہ'' اور مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے پلیٹ فارم سے اقامتِ دین کے لیے جِدّوجُہد کی۔اسی طرح آئندہ اَدوار میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُس کے بندے اس جِدّوجُہد کا علم سنبھالے رہیں گے۔مختلف تحریکیں اس مشن کی ترویج وترقی کے لیے مختلف انداز میں کردار ادا کرتی رہیں گی اور بالآخران اجتماعی اور مرحلہ وار

کوششوں کے نتیجے میں جب اللہ کو منظور ہوگا اسلام بطور دین پوری دنیا میں غالب ہو جائے گا۔

**آیت ۲۰** ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۰﴾ ’’تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟‘‘

**آیت ۲۱** ﴿وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝۲۱﴾ ’’اور جب انہیں قرآن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو یہ سجدہ نہیں کرتے؟‘‘

**آیت ۲۲** ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۝۲۲﴾ ’’بلکہ یہ کافر تو جھٹلا رہے ہیں۔‘‘

اس آیت کے الفاظ سے یہ اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کفر اور تکذیب باہم مترادفات نہیں بلکہ الگ الگ معنیٰ کے حامل دو الفاظ ہیں۔ کفر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں۔ اس مفہوم میں کسی انسان کا ’’کفر‘‘ یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت سے متعلق جو گواہیاں رکھی ہیں، وہ جانتے بوجھتے ان گواہیوں کو چھپا دے اور لوگوں کے سامنے ان کا اقرار و اظہار نہ کرے۔ جبکہ تکذیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان آیات کو جھٹلانا ہے جو انسانی فطرت میں موجود گواہیوں کو اُجاگر (activate) کرنے کے لیے اس کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لحاظ سے کفر اور تکذیب دو الگ الگ جرائم ہیں۔ بلکہ اس وضاحت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کفر کے مقابلے میں تکذیب بڑا جرم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؑ کو جو چارٹر عطا کیا گیا تھا اس میں بھی ان دونوں جرائم کا ذکر الگ الگ ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو اس چارٹر کی عبارت:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹﴾

’’ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے، اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم یعنی کفر کے بارے میں تو شاید کوئی عذر بھی قبول ہو جائے۔ مثلاً یہ عذر کہ ماحول کے منفی اثرات کی وجہ سے کسی انسان کی روح یا فطرت پر غفلت یا



جہالت کے پردے پڑ گئے تھے، اور اس وجہ سے اس کی فطرت کے آئینے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پوری طرح سے منعکس نہ ہو سکی۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی صورت میں انسان کے سامنے باقاعدہ روشنی آ گئی اور اس روشنی سے بھی اس کو وہی پیغام ملا جو عین اُس کی اپنی فطرت کی پکار تھی تو اس کا جانتے بوجھتے ان آیات کو جھٹلا دینا یقیناً بہت بڑی ڈھٹائی اور بہت بڑا جرم ہے جس کے خلاف کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

**آیت ۲۳** ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝۲۳﴾ ’’اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ (اپنے اندر) کیا بھرے ہوئے ہیں۔‘‘

عام طور پر اس آیت کے بارے میں یہی سمجھا گیا ہے کہ اس میں انسان کے مال و دولت جمع کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دراصل اس سے دلوں اور سینوں کی گندگی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان لوگوں کے سینے کفر، عداوت، بغض، حسد، تکبّر وغیرہ کی غلاظتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ اللہ کی آیات کو پہچان لینے کے بعد بھی ان کی تکذیب کر رہے ہیں۔

**آیت ۲۴** ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۴﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔‘‘

**آیت ۲۵** ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۲۵﴾ ’’البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔‘‘

مَنَّ یَمُنُّ مَنًّا کے لغوی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کو کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی انتہا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْن سے مراد ایسا اَجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

❀❀❀

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

# ڈاکٹر اسرار احمدؒ: قرآن میں رچی بسی شخصیت

شاہ اجمل فاروق ندوی ☆

حرکت و روانی اس کائنات کا خاصّہ ہے۔ یہاں ہر چیز ایک مخصوص نظام کے مطابق حرکت میں رہتی ہے۔ البتہ حرکت کے ساتھ فنا بھی کائنات کا لازمی وصف ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو حرکت میں رہتی ہے' نمو پزیر اور رواں دواں رہتی ہے' ایک نہ ایک دن رک بھی جاتی ہے' پھر کبھی نہیں چلتی۔ کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح انسانی زندگی کا بھی یہی خاصّہ ہے: حرکت اور فنا۔ تاہم' بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایسی حرکت عطا فرما کر بھیجتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد بھی لگتا ہے کہ وہ رواں دواں ہی ہیں' اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اپنی زندگی وہ لوگ ایسی سرگرمی کے ساتھ گزارتے ہیں کہ سراپا حرکت و روانی بن جاتے ہیں۔ کسی منزل پر ٹھہرنا' رکنا اور سانس لینا اُن کے مزاج کے خلاف ہوتا ہے۔ ایسی ہی چلتی پھرتی' رواں دواں اور مسلسل حرکت رکھنے والی ایک عظیم شخصیت کو دنیا ڈاکٹر اسرار احمد (ولادت: ۲۶/اپریل ۱۹۳۲ء' وفات: ۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرنی ہو تو' ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی کوئی تقریر یا چھوٹا موٹا بیان سن لیجیے۔ چند ہی لمحات میں اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کسی زوردار اور متحرک شخصیت کو سن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اندر نہ جانے کیسی حرکت القا فرمائی تھی۔ وہ سراپا حرکت اور تحریک معلوم ہوتے تھے۔ یہ حرکت و تحریک ان کے شب و روز سے آگے بڑھ کر ان کی گفت و شنید سے بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔

## پہلا تعارف

یہ ۲۰۰۳ء کی بات ہے۔ ندوہ کے دورِ طالب علمی میں ہمیں اخبارات کا چسکا لگا۔ عالم عرب کے اخبارات کے ساتھ پڑوسی ممالک کے اردو اخبارات بھی ہم بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے لگے۔ پاکستان سے روزنامہ ''جنگ'' بھی آتا تھا۔ اُسے بھی شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتے

☆ انچارج اردو سیکشن' انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز' نئی دہلی؛ چیف ایڈیٹر ماہنامہ المؤمنات' لکھنؤ؛ ایڈیٹر ماہنامہ تسنیم' نئی دہلی



تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے نام سے پہلا تعارف وہیں حاصل ہوا۔ ان کے بیانات اور کالمز بہت پسند آئے۔ آہستہ آہستہ غائبانہ طور پر وہ ہماری ایک پسندیدہ شخصیت بن گئے۔ ایک دن روزنامہ ''جنگ''، ہی میں کسی مسئلے پر مشاہیر کی آراء شائع ہوئیں۔ ہر شخص کی رائے کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ اُس دن پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی تصویر دیکھی تو حیرت میں پڑ گیا۔ حیرت سے زیادہ تشویش ہوئی کہ خدا جانے یہ وہی اسرار احمد ہیں یا کوئی اور! نہ ماننے کی دلیل صرف یہ تھی کہ ہم نے اپنے ذہن میں جس اسرار احمد کی تصویر بنا رکھی تھی' وہ اتنے متشرع نہ تھے۔ آہستہ آہستہ ہم نے کچھ شک کے ساتھ مان ہی لیا کہ یہ وہی اسرار احمد ہیں' جن کے معتدل بیانات کے ہم گرویدہ ہیں۔

۲۰۰۴ء میں ندوہ سے تعلیم مکمل کر کے دلّی پہنچے۔ پاکستان کے QTV کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ہمارے سامنے کوئی دوسرا مسلم ٹی وی چینل نہ تھا' اس لیے اس کے پروگرام سننا ہمارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ وہی تصویر والے ڈاکٹر اسرار احمد یہاں بھی موجود ہیں۔ قرآن کا درس دے رہے ہیں۔ اب ہماری محبت' عقیدت میں بدل گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے مسلسل دروسِ قرآن کا آغاز ہی ہوا تھا۔ ہم کسی شاگرد کی طرح کاغذ قلم لے کر بیٹھتے اور ان کے بیان کردہ نکات نوٹ کرتے۔ وقت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا عرفان حاصل ہونے لگا' ان کے مقامِ بلند کا اندازہ ہونے لگا۔ ان کے تبحر علمی اور بالخصوص قرآنی علوم پر بے مثال گرفت نے ہمیں اُن کا عاشق بنا دیا۔ بعد میں QTV نے بوجوہ اُن کے دروس کا سلسلہ بند کر دیا' لیکن اللہ تعالیٰ کو اُن کی آخری عمر میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچانا تھا' اس کے لیے ذریعہ QTV ہی کو بنایا۔ گھر گھر میں ڈاکٹر صاحب کا چرچا ہونے لگا اور وہ ہندوستان میں بھی ہر مسلم گھرانے کے روحانی مربی کی شکل میں سامنے آئے۔

## برّصغیر میں عام مقبولیت

ہندوستان کے مسلم طبقے میں ڈاکٹر صاحب کی مقبولیت و محبوبیت کا اندازہ دو موقعوں پر سامنے آیا۔ ایک اُن کے سفرِ ہندوستان کے موقعے پر اور دوسرا اُن کی وفات کے موقعے پر۔ ڈاکٹر صاحب ہندوستان آئے تو ایک ایک دن میں کئی بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرنے کا نظم کیا گیا۔ صبح کے وقت عیدگاہ دہلی میں ہیں' دوپہر میں جامع مسجد دہلی میں' بعد مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تو بعد عشاء مرکز جماعت اسلامی ہند کی مسجد میں۔ دو تین دن کے طوفانی دورے میں

یہی عالم رہا۔ اخبارات میں کئی کئی جلسوں کے اشتہارات شائع ہوتے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے بینر اور پوسٹر لگتے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ہر جگہ پہنچتے اور پوری شان سے خطاب فرماتے۔ کیا مرد‘ کیا عورتیں‘ کیا بوڑھے اور کیا جوان‘ سب پروانہ وار ان کی تقریریں سننے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہ دلّی کی صورت حال تھی۔ دوسرے بڑے شہروں میں بھی اسی طرح کی کیفیت سننے میں آئی۔

اس کے دو چار سال بعد جب ڈاکٹر صاحب نے رحلت فرمائی تو بھی گھر گھر میں غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ اخبارات کئی دن تک تعزیتی بیانات اور تعزیتی جلسوں کی خبریں شائع کرتے رہے‘ جیسے کہ وہ یہیں کے تھے اور یہیں رہ رہے تھے۔

اس محبوبیت ومقبولیت کی تاویل ہم صرف یہی کرتے ہیں کہ اللہ کے اُس بندے نے اپنی پوری زندگی کو قرآنی زندگی بنالیا تھا۔ قرآن ہی پر جیے اور اسی کو عام کرتے کرتے اس دنیا سے چلے گئے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو قبولِ عام کا درجہ عطا نہ فرماتا! ربِّ کریم نے QTV کو ذریعہ بنایا اور پورے برّصغیر میں اُن کی لہر چل پڑی۔ ہر سلیم الفطرت شخص ان کا دل دادہ ہوگیا۔ اُن کے ٹھوس علمی افکار کے باوجود بہت کم عرصے میں عوام وخواص میں ایسی محبوبیت و مقبولیت سوائے عطائے الٰہی کے کچھ نہیں تھی!

## شرفِ نیاز

۲۰۰۴ء میں ان کی ہندوستان آمد کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ وہاں اُن کی تقریر کا موضوع تھا: ’’موت کا عقیدہ‘‘۔ اُن کی آمد سے پہلے ہی ہال بھر چکا تھا۔ تقریر کے وقت سے چند منٹ پہلے ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ موضوع عوامی سے زیادہ فلسفیانہ تھا‘ چنانچہ ان کی گفتگو پر دونوں رنگ غالب رہے۔ عوامی کم اور فلسفیانہ زیادہ‘ لیکن وہ مجمع کو ایسی گرفت میں لے لیتے تھے کہ کیا مجال کوئی اپنی جگہ سے ہل جائے۔ پورا مجمع ڈیڑھ دو گھنٹے ساکت و جامد بیٹھا رہا اور ڈاکٹر صاحب خطاب فرماتے رہے۔ وہیں تقریر سے پہلے ناظم جلسہ نے یہ بھی بتایا کہ جب ہم اِس پروگرام کے لیے وقت لینے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے تو وہ اپنی قیام گاہ پر نہیں تھے۔ کسی جلسے ہی میں گئے ہوئے تھے۔ ابھی ہم وہاں سے واپس آ بھی نہ سکے تھے کہ ہمارے دیے ہوئے نمبر پر ڈاکٹر صاحب کا فون آچکا تھا کہ آپ پروگرام طے کردیں‘ میں وقتِ مقررہ پر (ان شاء اللہ) ضرور حاضر ہوجاؤں گا۔



## قرآنی تحریک

ڈاکٹر اسرار احمد ہریانہ کے مشہور علاقے حصار میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد مع اہلِ خانہ پاکستان منتقل ہوگئے۔ ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی سے متأثر ہوئے اور اپنی تعلیم کے ساتھ جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ بانی جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ملک کے عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو اس پر سخت احتجاج کیا‘ حتیٰ کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ۷۱-۱۹۷۰ء ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا سب سے اہم موڑ ثابت ہوا‘ جب انھیں حجاز مقدس میں خاصے لمبے عرصے قیام کا موقع ملا۔ حج کی سعادت بھی میسّر آئی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی میڈیکل پریکٹس ترک کرنے کا اہم فیصلہ لیا اور ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی بنیاد رکھ دی۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی اور ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی لاہور قائم کی۔ مختلف پلیٹ فارم قائم کرکے انہوں نے ملک بھر میں مختلف نوعیتوں سے فہمِ قرآن کی تحریک اُٹھا دی۔ ہفتہ وار دروسِ قرآن‘ سالانہ قرآن کانفرنسیں اور اس کے علاوہ متعدد پہلوؤں سے قرآن کریم کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا منفرد پروگرام شروع کیا (جو اُن کے صلبی وروحانی بیٹے پاکستان کے طول وعرض میں سینکڑوں مقامات پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔) ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مفسّرِ قرآن مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے آخری خواب (اشاعتِ قرآن) کو عام کرنے والی شخصیت ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتی۔ مفتی محمد رفیع عثمانیؒ نے بھی تقریباً اسی طرح کا تأثر ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہند کو مجدد کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ قرآن کریم کے اندر اُتر گئے تھے‘ یا یوں کہیے کہ قرآن کریم کو اپنے اوپر اوڑھ لیا تھا۔ اس لیے ان کی شخصیت قرآن کریم میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ وہ عہدِ حاضر میں شاید پورے عالمِ اسلام میں قرآن کریم کے سب سے ممتاز مبلغ وداعی کی حیثیت سے سامنے آئے۔

## حق گوئی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے حق گوئی کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ وہ ہر بات پوری مضبوطی کے ساتھ کہتے تھے اور بہ بانگِ دُہل کہتے تھے۔ ہندوستان تشریف لائے اور مرکز

جماعت اسلامی ہند میں خطاب فرمایا تو جماعت کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ اپنا اختلاف بھی ذکر کیا۔ پاکستان میں جاوید احمد غامدی اور ان کے ہم نواؤں کے انکارِ حدیث آمیز افکار کے خلاف محاذ سنبھالا۔ خود بھی مسلسل لکھا اور دوسروں سے بھی لکھوایا۔ اپنے ایک استاد مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے ہونے والی سخت تفسیری غلطیوں کا ردّ کیا۔ سورۃ النور کا درس دیتے دیتے رکے’’حدِرجم‘‘ پر اپنے استاد کی صریح غلطی کا تذکرہ کیا اور ان کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کرائی۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد کچھ عرصہ تبلیغی جماعت سے وابستہ رہے تاکہ اجتماعیت کے ساتھ کام چلتا رہے۔ ان کی دعوت وتبلیغ کو’’Quran-centric‘‘نہیں پایا تو اپنا اختلاف صاف صاف بیان کر کے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے باوجود تمام جماعتوں کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف اور تمام شخصیات کا ادب و احترام بھی علی الاعلان کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے حقیقی مسلک پر قائم تھے‘ یعنی کھلے دل سے سب کا اعتراف اور صاف زبان میں علمی اختلاف۔

## اعتدال وتوازن

ایک طرف وہ خلافت کے عظیم علم بردار تھے۔ افغان طالبان کے پُرزور حامی اور ان کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں عالمی خلافت کانفرنس میں شرکت کے بعد ’’تحریک خلافت پاکستان‘‘ قائم کر چکے تھے‘ تو دوسری طرف امام غزالیؒ‘ شیخ محی الدین ابن عربیؒ‘ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور شیخ احمد سرہندی وغیرہ (رحمہم اللہ) کے صوفیانہ افکار ونظریات کے بھی حامی تھے۔ اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب لاہور کے علاقے سمن آباد کی مسجد خضراء میں درس قرآن دیتے تھے۔ مسلسل ڈھائی گھنٹے درس چلتا تھا۔ حاضرین کی تعداد عام طور پر پانچ چھ سو تک پہنچ جاتی تھی۔ مسجد خضراء کا سنگ بنیاد مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوریؒ نے رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے اس درس کی بے پناہ مقبولیت کا سہرا حضرت مفسرِ قرآن کے سر باندھتے تھے اور اسے اُن کا روحانی فیض اور کرامت سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

’’مسجد خضراء سمن آباد میں اس دعوتِ قرآن کو جو پزیرائی حاصل ہوئی‘ اس پر میں خود اور میرے قریبی ساتھی سب کے سب شدید حیران تھے۔ بالآخر اس کا راز ایک روز کھل ہی گیا۔ آج کے عقلیت زدہ بلکہ گزیدہ لوگ تو شاید اس بات پر ناک بھوں



چڑھائیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسجد خضراء کی اس استثنائی کیفیت کا اصل راز جو مجھے ایک دن اچانک معلوم ہوا‘ یہ تھا کہ اس کا سنگ بنیاد اُس مردِ درویش نے رکھا تھا جسے دنیا مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نام سے جانتی ہے اور جس نے خود بھی پورے چالیس سال تک ارضِ لاہور پر درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ گویا معاملہ وہی تھا جو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!‘‘

(دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر‘ طبع جدید‘ ستمبر ۲۰۲۱ء‘ ص ۱۷۰)

## عظیم خلا

علماءِ دہلی کی یادگار‘ مفسرِ قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ سے بھی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے گہرے مراسم تھے۔ ان مراسم کا نکتۂ اتحاد تفسیری اشتغال ہی تھا۔ افسوس کہ اب یہ دونوں شخصیات شہرِ خموشاں میں جا سوئیں۔ کچھ دن پہلے مَیں نے تفسیرِ قرآن کے متعلق قائم کیے گئے علماء کے ایک واٹس ایپ گروپ پر سوال کیا: ’’کیا موجودہ وقت میں برصغیر میں ایسی کوئی شخصیت ہے‘ جس کا اوڑھنا بچھونا تفسیرِ قرآن ہو؟ وہ صرف کسی ادارے میں تفسیر کا استاد نہ ہو‘ بلکہ علومِ تفسیر کے ساتھ مسلسل ومتواتر اشتغال رکھتا ہو؟ جیسا کہ ماضی بعید میں مولانا احمد علی لاہوریؒ اور ماضی قریب میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ تھے؟‘‘ آپ یقین جانیے کہ جوابات میں بس دو نام آئے اور وہ دونوں بھی دو اداروں میں تفسیر کی تدریس انجام دے رہے تھے۔ ہمارے مطلوبہ معیار کے مصداق نہ تھے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں‘ بلکہ ایک عظیم المیہ ہے۔

۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر صاحب کی وفات سے سب سے بڑا نقصان یہی ہوا کہ تفسیرِ قرآن کے میدان میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پُر ہونا بہ ظاہر آسان نظر نہیں آتا۔ یوں اللہ کی قدرتِ کاملہ سے کیا بعید؟ اُن کے بعد پوری اُمت میں ایسی کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی جو قرآن کریم پر ایسا استحضار بھی رکھتی ہو اور اس کو ایک تحریک کی شکل میں پیش بھی کر رہی ہو‘ وہ بھی پوری حکمت اور اعتدال کے ساتھ۔ ہم بجا طور پر ڈاکٹر صاحب کو ’’قرآن کریم میں رچی بسی شخصیت‘‘ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

# روزہ اور تزکیۂ نفس

مولانا عبدالمتین ☆

## روزے کی فرضیت

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے' جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا' تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔''

اس آیت میں اللہ ربّ العزت روزوں کی فرضیت کا اعلان فرماتے ہیں۔ سرکارِ دو عالَم خاتم النّبیّین ﷺ نے جب مکّہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو سن دو ہجری میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہوتے ہی روزوں کا جو سلسلہ اس سے پہلے چل رہا تھا وہ فرض روزوں میں تبدیل ہو گیا۔ روزہ رکھنے کا تصور تو اس سے پہلے بھی موجود تھا' ایامِ بیض کے روزے بھی رکھے جاتے تھے' لیکن اب رمضان المبارک کو ''ماہِ صیام'' قرار دے کر اس کے روزوں کو فرض کا درجہ دے دیا گیا۔

اللہ ربّ العزت نے انداز ایسا اختیار کیا کہ ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ﴾ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ واقعتاً خالق اپنی مخلوق کو کسی بات کا حکم دے رہا ہے۔ پوچھا نہیں جا رہا کہ تم پر روزے فرض کریں یا نہیں؟ یا ہم تم پر روزے فرض کرنے والے ہیں! بلکہ جو بارگاہ میں طے ہوا اس کی اطلاع دی جا رہی ہے کہ تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے۔ ایک مخلوق کی حیثیت سے اپنے خالق کا حکم تمہیں ہر حال میں ماننا ہے' اب دوسری کوئی بات نہیں کرنی۔ بس روزوں کا اہتمام کرنا ہے۔ اس حکم کی حکمتیں نہیں پوچھنی' اپنی عقل کے گھوڑے نہیں دوڑانے کہ پہلے نفلی تھا اب اچانک فرض کیسے ہوا اور کیوں ہوا' وغیرہ۔

☆ مدیر' مدرسہ دارارقم' لیاری کراچی



## صوم کا مفہوم اور تاریخی حیثیت

مذکورہ آیت میں ''صیام'' کا لفظ (مصدر) استعمال ہوا ہے جس کے معنی روزہ رکھنے کے ہیں۔ ''صوم'' لغت کے اعتبار سے کسی کام سے رک جانے کو کہتے ہیں۔ روزے کو صوم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں سحری کا وقت ختم ہونے سے سورج غروب ہونے تک کھانے' پینے اور ازدواجی تعلق قائم کرنے سے خود کو روکنا پڑتا ہے۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں اللہ ربّ العزت نے ارشاد فرمایا کہ ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ''جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا'' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمّت سے پہلے بھی روزوں کا سلسلہ موجود تھا۔ آپ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں یہودیوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی' جو عاشورہ یعنی محرم الحرام کی دس تاریخ کا روزہ رکھنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا یہ تھا کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے مظالم سے بنی اسرائیل کو آزادی عطا فرمائی تھی۔ اس کے شکرانے کے طور پر ان میں روزہ رکھنے کا رواج پیدا ہوا اور آپ ﷺ کے زمانے تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ عیسائی مذہب میں بھی روزے رائج تھے۔ اسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم سے پہلی اُمتوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے لہٰذا تم سے کسی نئے اور انوکھے کام کا نہیں کہا جا رہا۔ اس طرح ایک تسلی والی بات کر دی' جیسے ہم کسی شخص کو کوئی نیا کام کرنے کا کہہ دیتے ہیں کہ آپ یہ کام کریں اور ساتھ بتاتے ہیں کہ یہ کام فلاں بھی کر چکا ہے اور مَیں نے خود بھی یہ کام کیا ہے' وغیرہ۔ تو اب اس کرنے والے کو ذرا تسلی ہو جاتی ہے' اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ کام میں پہلی بار نہیں کر رہا' یہ اگر اتنا مشکل ہوتا تو کوئی بھی نہ کر سکتا۔ تو اللہ ربّ العزت نے جیسے تسلی کا کلمہ ذکر فرما دیا کہ تم سے پہلی اُمتوں میں بھی روزے کی عبادت کا تصوّر موجود تھا۔

## روزے کا مقصد

آیت کے آخر میں فرمایا کہ روزے کا اصل مقصد کیا ہے! بھوک اور پیاس برداشت کرنے اور ازدواجی تعلق سے دور رہنے کا اصل مقصد کیا ہے؟ اللہ ربّ العزت ہمیں بھوکا اور پیاسا رکھ کر کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ اور

پرہیزگاری پیدا ہو۔ نیک اعمال کرنے اور بُرائیوں سے بچنے کی عادت پیدا ہوجائے۔ یہ روزے کا اصل مقصد ہے۔

یوں تو تمام عبادات کا یہی مقصد ہے۔ نماز کا‘ حج کا‘ اور زکوٰۃ وصدقات کا مقصد بھی تقویٰ کا حصول ہے‘ لیکن دوسری عبادات کے مقابلے میں روزے سے یہ مقصد جلد اور زیادہ اچھے طریقے سے پورا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں بطورِ خاص اس کا ذکر فرمایا۔

## تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ کے معنی ہیں بچنا‘ کسی چیز سے پرہیز کرنا‘ کسی چیز سے اپنے آپ کو اہتمام کر کے بچانا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کی ملاقات حضرت ابی بن کعب ؓ سے ہوئی جو بہت بڑے صحابی تھے۔ ان کو ’’اقرأ الصَّحابۃ‘‘ کہا جاتا ہے‘ یعنی آپؓ صحابہ کرام ؓ میں قراءت کے سب سے بڑے ماہر اور قاری ہیں۔ آپ سب سے زیادہ قراءت اور تجوید کے جاننے والے تھے‘ سورۃ الفاتحہ کی فضیلت کی روایت ان ہی سے منقول ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے ان سے تقویٰ کی وضاحت چاہی جس کا ذکر قرآن میں بار بار کیا گیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب ؓ نے فرمایا کہ: اے امیر المؤمنین! آپ کبھی ایسے راستے سے گئے ہیں جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں‘ کانٹے دار راستہ ہو اور پگ ڈنڈی بھی تنگ ہو؟ حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ ایسا تو بہت بار ہوا ہے‘ کئی مرتبہ میں ایسے راستے سے گزرا ہوں۔ حضرت ابی بن کعب ؓ نے پوچھا: آپ ایسے راستے سے کیسے جاتے ہیں؟ حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ میں اپنا دامن سمیٹ سمیٹ کر جاتا ہوں کہ کہیں یہ کانٹے میرے کپڑوں میں نہ چبھ جائیں‘ کہیں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس پر حضرت ابی بن کعب ؓ نے فرمایا کہ یہی تقویٰ ہے کہ ساری زندگی خواہشات اور نفسانیت کے خطرناک راستے میں خود کو سمیٹ سمیٹ کر بچانا اور گناہوں میں پڑنے سے بچ کر زندگی کے راستے کو پار کرنا۔ یعنی جس طرح آپ ایسے راستے میں اپنے کپڑے سمیٹ کر جاتے ہیں ویسے ہی دنیا میں خود کو ان نفسانی و شیطانی حربوں سے بچانے کی کوشش کریں تو یہ روش تقویٰ کی ہے۔

## نفس اور شیطان

علماء فرماتے ہیں کہ نفس اور شیطان آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان دونوں کا جنم بھی ایک



ساتھ ہوا ہے۔ ان دونوں کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو کسی نہ کسی طریقے سے راہِ راست سے ہٹا کر گمراہ کرنا اور پھر اسے اپنی منزلِ مراد یعنی ’’جنت‘‘ سے دور کرنا۔ بقول خواجہ مجذوبؒ ؎

نفس اور شیطاں ہیں خنجر در بغل
وار ہونے کو ہے اے غافل سنبھل!

روزہ اس منزلِ مراد یعنی جنّت کو حاصل کرنے کی ایک سیڑھی ہے کہ جب انسان روزے کی عبادت میں مصروف رہتا ہے تو نفس کی تربیت کا عمل شروع ہوجاتا ہے‘ جو تقویٰ کا جوہر پیدا کرتی ہے۔ جب تقویٰ پیدا ہوتا ہے انسان ہدایت کے رستے پر چل پڑتا ہے اور بالآخر یہ رستہ جنت تک پہنچادیتا ہے۔

## روزہ اور نفس کی تربیت کا عمل

اس پورے پس منظر میں اصل تصادم نفس کی تربیت کا ہے۔ اگر تربیت ٹھیک ہوئی تو تقویٰ کا حصول ممکن رہے گا‘ ورنہ ناممکن۔ نفس کو اللہ ربّ العزت نے اس انداز سے پیدا فرمایا ہے کہ اس کی جتنی بات مانی جائے اتنا ہی یہ بگڑتا جاتا ہے اور جتنا اس کی بات ردّ کی جائے اتنا ہی یہ سدھرنے لگتا ہے۔ اگر اس کو زیادہ کھلایا پلایا جائے تو یہ زیادہ بگڑتا ہے۔ اس کی خواہشات کو جتنا زیادہ پورا کیا جائے اتنا ہی اس میں بگاڑ بڑھتا رہتا ہے۔ جتنا اس کی بات مانی جائے گی یہ اتنا ہی زیادہ بگڑنے لگتا ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کی ہر ضد پوری کی جائے تو دوسرے دن اتنا ہی ان کی ضد میں اضافہ ہوتا ہے‘ ٹھیک ایسی ہی نفس کی مثال ہے۔ یہ نفس چاہتا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کھاؤں‘ زیادہ آرام کروں‘ ہر وقت سوتا رہوں‘ عیاشی کروں‘ مزے سے بیٹھا رہوں‘ تکلیف اور مشقت سے دور رہوں۔ لہٰذا اگر اس کی مانتے جائیں تو یہ بس نہیں کرے گا بلکہ اضافی خواہشات کی تمنا کرتا جائے گا۔

روزے کی صورت میں اللہ ربّ العزت نے نفس کی تربیت کا ایک بہترین انتظام فرمادیا کہ اسے سدھارنا ہے تو بہت مشکل مگر تمہیں جو روزے کا طریقہ بتایا جارہا ہے اس کے ذریعے تم اپنے نفس کو ٹھیک کرنے کی کامیاب کوشش کرسکتے ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم کچھ وقت کے لیے اپنا کھانا پینا اور جائز جنسی تعلق چھوڑ دو تو نفس پر یہ سب بھاری پڑے گا۔ اصول یہ ہے کہ جب بھی نفس پر مشقت آتی ہے تو ابتدا میں بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ تکلیف ایک جوہر

اور ایسی قابلیت پیدا کر دیتی ہے کہ نفس انسان پر غالب نہیں آتا۔ اس میں سدھار پن آجاتا ہے۔

## خواہشاتِ نفسانی کا اثر

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص کم کھانا کھاتا ہے تو اسے بیت الخلا کی حاجت بھی کم ہوتی ہے' نیند بھی کم آتی ہے' دل میں جذبات اور خواہشات کم پیدا ہوتی ہیں۔ روزے میں کم کھانا معمول بن جاتا ہے' جس کے نتیجے میں ان سب چیزوں سے بچنے کی طاقت خود سے پیدا ہوجاتی ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں نفس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شیر خوار بچہ جو ماں کے سینے سے چمٹ کر دودھ پیتا ہے۔ جب اس کے دودھ پینے کی مدت مکمل ہوجاتی ہے تو ہم اسے سینے سے دور کر دیتے ہیں۔ بچہ رونے لگ جاتا ہے' چیخنے لگتا ہے' بعض اوقات بیمار بھی ہوتا ہے لیکن ہم یہ سب برداشت کرتے ہیں اور اسے پھر سے ماں کا دودھ نہیں پلاتے۔ اگر اس بچے کی ضد پوری کی جائے تو وہ شباب کی سرحد کو چھولے گا لیکن اس کی یہ عادت نہیں چھوٹے گی۔ تو ضروری ہے کہ اس پر کچھ نہ کچھ مشقت لائی جائے' بار ڈالا جائے' اس نیت سے کہ آئندہ وہ اس عادت سے محفوظ رہے۔

## نفس کی تربیت کا چار نکاتی لائحہ عمل

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں نفس کے بگاڑ کو کم کرنے کے چار طریقے ذکر فرمائے ہیں:

(۱) قلّتِ کلام: یعنی انسان کم بات کرے۔ زیادہ بولنے کی کوشش نہ کرے۔ کثرت کے ساتھ اپنی زبان کو نہ چلائے' بلکہ جب ضرورت ہو تب بولے۔ جو زیادہ بولتا ہے وہ غیبت زیادہ کرتا ہے۔ زیادہ بولنے سے بہتان طرازی کا بھی خطرہ رہتا ہے' جھوٹ بھی بول سکتا ہے' تکبر کا کلمہ بھی زبان سے نکال سکتا ہے۔ ان سب کا آسان حل یہ ہے کہ وہ زیادہ بولنے سے پرہیز کرے۔

(۲) قلّتِ طعام: یعنی کم کھائے۔ ہر وقت کھانے کا معمول نہ ہو' زیادہ کھانے کی ترتیب نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت بے وقت کھائے جارہے ہیں۔ کہیں کھڑے کھڑے کھا رہے ہیں' کہیں دوستوں کے ساتھ اور کبھی ناشتہ دو تین بار۔

(۳) قلّتِ منام: یعنی سونا بھی کم کرے' کیوں کہ زیادہ سونا زیادہ وبال کا ذریعہ بن سکتا ہے۔



حکماء فرماتے ہیں کہ زیادہ سونے کی صورت میں انسان کا دماغ کمزور ہوجاتا ہے جبکہ جو بہت کم سوتا ہے اس کا جسم کمزور ہوجاتا ہے۔ سونے کا ایک درمیانہ معمول ہونا چاہیے جتنا انسان کی صحت کے لیے ضروری ہو۔

(۴) قلّتِ اختلاط مع الانام: یعنی لوگوں کے ساتھ کم از کم تعلق رکھے۔ غیر ضروری تعلق سے اجتناب کرے' بس حقوق العباد کی فکر کرے۔ زیادہ میل جول سے گناہوں کے مواقع بڑھنے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔

## نفسانی خواہشات ٹالنے کا طریقہ

جو شخص یہ چار کام کرے گا اس کے لیے نفس کو راہِ راست پر لانا آسان ہو جائے گا۔ انسان متقی تب ہی بن سکتا ہے جب وہ نفس کے تقاضوں پر عمل نہ کرے۔ جو دل چاہ رہا ہے اس کے خلاف کرے۔ مثلاً فجر کے وقت اگر دل چاہ رہا ہے کہ سویا رہوں تو نہ سوئے۔ تنگدستی میں دل چاہ رہا ہے کہ حرام کما کر مالا مال ہوجاؤں تو ناداری برداشت کرے۔

ڈاکٹر عبدالحئ عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا واقعہ خود ذکر کیا کہ جو نفس کہہ رہا ہے اس کے خلاف کیسے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رات کو تہجد کے لیے اٹھا تو شیطان نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ بڑھاپے میں تہجد پڑھنے کی کیا ضرورت ہے! گویا نفس سے ان کی گفتگو ہو رہی ہے کہ آپ ابھی اپنی صحت کا خیال رکھیں' یہ کوئی فرض نماز تو نہیں بلکہ نفلی نماز ہے' یہ تو آپ پر لازم بھی نہیں ہے اور آپ پر اتنی کمزوری آگئی ہے' لیکن ڈاکٹر صاحب نے من ہی من میں جواب دیا کہ میں تہجد پڑھنے کے لیے نہیں اٹھ رہا بلکہ بس بیٹھ کر دو چار ذکر کے کلمات کہہ کر پھر سو جاؤں گا۔ جب وہ بیٹھ گئے اور ذکر کیا تو سونے کا تقاضا ہوا۔ اس پر انہوں نے نفس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایک مرتبہ جب اٹھ ہی گئے ہو اور بیٹھ ہی گئے ہو تو وضو کر کے آجاؤ اور پھر سو جاؤ۔ اب جیسے نفس ہمیں ٹالتا ہے بالکل ویسے ہی انہوں نے نفس کو ٹالنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں وضو کر کے آجاؤں گا اور پھر فوراً سو جاؤں گا' تہجد پڑھنے کا ارادہ نہیں کر رہا۔ انہوں نے وضو کیا اور بیٹھ گئے تو نفس نے کہا کہ اب تو سو جاؤ۔ انہوں نے کہا اب جب اُٹھ ہی گئے ہو' اپنی نیند کا خمار توڑ دیا ہے اور باوضو بھی ہو تو اب دو رکعت نماز پڑھ کے سو جاؤ۔ آخر میں وہ دو رکعت پڑھ ہی لیتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ نفس کو ٹالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یعنی یہ انداز اختیار کیا گیا کہ نفس جس

بات کا تقاضا کر رہا ہے اسی بات کے خلاف جانا۔ جس چیز کا داعیہ پیدا ہو رہا ہے اس کے خلاف چلنا۔ تو جب تک اس نفس پر آرے نہیں چلیں گے تب تک تقویٰ کا جوہر پیدا نہیں ہوگا۔

## روزہ: ایک جامع تربیتی پروگرام

روزے کے ذریعے اللہ ربّ العزت نے اس مشکل اور طویل کام کو آسان کر دیا کہ انسان کی طبیعت کے خلاف جتنے کام ہیں وہ سب اس میں ایک ساتھ شامل کر دیے گئے۔ اب تمہارا کھانا بھی بند ہے‘ تمہارا پینا بھی ممنوع ہے‘ تمہارا ازدواجی تعلق قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ روزے میں غصہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے اور تم جانتے ہو کہ جو گناہ روزے کے بغیر کیا جائے وہ اگر روزے میں کیا جائے تو اس کی شدت زیادہ ہے۔ روایات میں ہے کہ جو شخص روزے کی حالت میں زبان سے جو جی چاہے نکال لیتا ہے تو اللہ کو ایسے روزے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بے فائدہ اپنا کھانا پینا چھوڑ رہا ہے۔ یہ سارے مقاصد روزے میں ایک ساتھ جمع کر دیے گئے جو نفس کو قابو کرنے کا ذریعہ ہیں تاکہ ایک مہینے تک تم اس نسخے پر عمل کرتے رہو اور متقی بننے کا سفر شروع کر سکو۔

تصوّر کریں کہ ایک بند کمرے میں کوئی فرد موجود ہے اور روزے سے اس کی زبان سوکھ چکی ہو۔ کوئی اسے دیکھ بھی نہیں رہا۔ وہاں ایک کولر رکھا ہوا ہو جس کے نیچے گلاس بھی ہو‘ اس میں ٹھنڈا پانی موجود ہو اور وہ تھوڑا تھوڑا ٹپکتا بھی رہے۔ اس پانی کی ٹھنڈک اس گلاس میں بھی نظر آئے۔ الغرض نفس کے جو تقاضے ہیں وہ سب کے سب موجود ہوں۔ پیاس بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہو لیکن روزے کی وجہ سے وہ ان تقاضوں پر ہرگز عمل نہیں کرتا۔ اللہ ربّ العزت نے روزے دار میں قدرتی طور پر وہ صلاحیت رکھی ہے جو نفس کی تربیت کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کی تہذیب اور اس کو سدھارنا آسان ہو جائے۔ جب ایک مہینے تک یہ تربیت کا عمل جاری رہے گا تو گیارہ مہینوں تک اس کا اثر باقی رہے گا۔ پھر مزید قدرت پیدا کرنے کے لیے ایک اور رمضان آ جائے گا اور روزے کا مقصد یعنی تقویٰ کا حصول ممکن ہو جائے گا‘ ان شاء اللہ!

❁❁❁

# مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں
# اقبالؒ کا اُمّت کے لیے پیغام

ارسلان اللہ خان ☆

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق(۱)

''تو پھر اے مشرق کی عوام! تمہیں کیا کرنا چاہیے تاکہ مشرق کا دور پھر سے روشن ہو جائے؟''

مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں علّامہ اقبالؒ، اہلِ مشرق کو سمجھاتے ہیں کہ اب اُنہیں کیا کرنا چاہیے۔ اقوامِ شرق کو چاہیے کہ یورپ کی کاری گری سمجھیں۔ مغرب کا کمال یہ ہے کہ اُس نے مشرق کے ریشم سے قالین بنایا، اسی کے سامنے بیچنے کے لیے پیش کر دیا اور عجیب بات یہ ہے کہ مشرق والے اس قالین کو فخر سے خرید بھی رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک مشرق اس سمندر کی مانند ہے جس کے اندر قیمتی موتی ہیں لیکن اُس کے پاس وہ غوطہ خور نہیں جو ان موتیوں کو نکال سکیں۔ چنانچہ مغرب اپنے غوطہ خوروں کے ذریعے وہ موتی نکالتا ہے اور اُس سے استفادہ کرتا ہے۔

اقبالؒ چاہتے ہیں کہ شرق کے لوگ محض مغرب کے مقلّد بن کر نہ رہ جائیں بلکہ خود بھی تحقیق کے میدان میں اُتریں۔ پاک و ہند کے کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مٹھی بھر انگریزوں نے غلام بنالیا۔ یہ بات اقبالؒ جیسے حسّاس شاعر کے لیے نہایت افسوس ناک ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند سائنسی علوم میں بھی ترقی کریں اور سوشل سائنسز جیسے علوم و فنون میں بھی آگے بڑھیں۔ ان کی تمنا ہے کہ مسلمان فلسفہ، تاریخ، قانون، معاشیات، شہریت، سیاست اور عمرانیات جیسے علوم و فنون میں بھی کامل دسترس حاصل کریں۔ ایک مسلمان خواہ کتنے ہی مغربی علوم حاصل

☆ای میل: khanarsalanullah786@gmail.com



کر لے، اُس کی نگاہ ہمیشہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی جانب رہنی چاہیے۔ مسلمان وہی ہے جو رمزدینِ مصطفیٰ ﷺ سے آشنا ہو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ آپس میں اتحاد قائم کریں تاکہ مسلم اُمّت اپنی نشاۃِ ثانیہ حاصل کر سکے۔ مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جناب یوسف سلیم چشتی صاحب کے بقول: ''اگر اقبالؒ کی ساری شاعری کو ایک جسم کہا جائے تو مثنوی پس چہ باید کرد اُس کی روح ہے۔''(۲)

اقبالؒ ہر قسم کے تعصب سے پاک ایک دیانت دار مفکّر تھے۔ اُنہوں نے مغرب اور مشرق دونوں تہذیبوں کا مطالعہ کیا۔ مغرب کے مثبت پہلوؤں کی تحسین جبکہ منفی معاملات پر نقد کی۔ اقبالؒ کی خواہش تھی کہ مسلمان مغربی تجربات سے استفادہ کریں اور مشرق کی بعض فرسودہ روایات کو ترک کریں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد اگر کسی شخصیت نے تقلیدِ جامد کے خلاف اور اجتہاد کے حق میں دُرست معنی میں آواز بلند کی ہے تو وہ اقبالؒ ہی ہیں۔ ''پس چہ باید کرد'' کے مطالعے کو اگر پانچ نکات میں سمیٹا جائے تو وہ یہ ہیں:

(۱) مشرق کی فرسودہ روایات کو ترک کیا جائے۔
(۲) اسلام میں اجتہاد کا دَروا کیا جائے۔
(۳) مغرب کی اندھی تقلید سے گریز کیا جائے۔
(۴) مغرب سے تحقیق کا وہی گُر سیکھا جائے جو دراصل اُنہوں نے مشرق سے حاصل کیا ہے۔
(۵) مغرب سے مرعوب ہونے کے بجائے اپنی اچھی روایات کو فخر سے اپنایا جائے۔

کتاب ''زندہ اقبالؒ'' میں ہے کہ اقبالؒ نے ۱۳/اگست ۱۹۱۸ء کو اکبرالٰہ آبادی کو خط لکھ کر مشرق کے بزرگوں کی صحبت کو یورپ کی درس گاہوں سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا:

> ''واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کے بجائے اُن کی گرمیٔ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔ پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دورانِ گفتگو کہنے لگے: معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ حالت غیر ہو گئی اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درس گاہوں میں ان کا نشان نہیں۔''

اپنے لیکچرز میں یورپی تہذیب اور اسلامی ثقافت کے بارے میں اقبالؒ لکھتے ہیں:

''دورِ حاضر کی تاریخ کی سب سے زیادہ توجّہ طلب بات عالَمِ اسلام کی وہ برق رفتاری ہے جس کے ساتھ دُنیائے اسلام روحانی طور پر بھی مغرب کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ اس رغبت میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ یورپی تہذیب خرد کے ارتقاء کے لحاظ سے اسلامی ثقافت ہی کی بعض اہم روایات کی مزید ترقی یافتہ شکل ہے۔ ڈر صرف اس بات کا ہے کہ کہیں یورپی تہذیب کی ظاہری چمک دمک ہماری اپنی ترقّی کی راہ کی رفتار میں رُکاوٹ نہ بن جائے اور ہم اُس تمدن کی روح تک نہ پہنچ پائیں۔''

اقبالؒ مغرب کے سامراجی نظام کے خلاف تھے' وہاں کی مثبت ترقّی کے مخالف نہیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ مسلمان جدید مدرسے قائم کریں جن میں ماڈرن آرٹس' سائنس' ٹیکنالوجی اور سوشل سائنسز کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ جمود سے باہر نکل سکیں۔ حکمران ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام جامد اور مقلّد رہ کر تقلید اور اطاعت ہی کو اپنا شیوہ بنائیں۔ اقبالؒ عوام کو اس غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ (۳)

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ (۴)

''نوعِ انسان فرنگیوں کے ہاتھوں بڑی ہی نالاں ہے۔ زندگی نے فرنگ سے کئی ہنگامے پائے ہیں۔''

''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں اقبالؒ نے ایک مردِ حُر کا تذکرہ کیا ہے جو روحانی نگاہ رکھتا ہے۔ اُس کی عقل قلب کے تابع ہے۔ وہ احساس' ہمدردی اور اخلاقیات کا مرصّع ہے۔ اس کے برعکس مغرب کی فکر ہے جو ایک انسان کو الحاد اور مادّہ پرستی کی جانب مائل کر رہی ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے پاس دل نہیں' ہمدردی نہیں' احساس نہیں' محض ایک مشین ہے جسے دولت' عیاشی اور مادّی فوائد کے سوا دُنیا میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا انسان نیکی و بدی میں تفریق کا قائل نہیں۔

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش (۵)

''اہلِ مغرب کی دانش تو ایسے ہی ہے جیسے کندھے پر تلوار ہو۔ یہ بنی نوعِ انسان کی ہلاکت کے درپے ہے۔''



مغرب نے روح کو جسم سے الگ کر دیا اور جسم کو ترجیح دی' جس کے نتیجے میں آج کا انسان روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

در جنیوا چیست غیر از مکر و فن
صیدِ تو ایں میش و آں نخچیرِ من! (۶)

''جنیوا (جو جمعیتِ اقوام کا مرکز ہے) میں مکر و فریب کی جگہ اور کیا ہے؟ یہی نا کہ اس کو تُو شکار کر لے' اس کو مَیں۔''

اسی بات کو اقبال ''ضربِ کلیم'' میں اس طرح کہتے ہیں:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا! (۷)

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کا ادارہ ہمیشہ مسلمانوں کے خون کو ہی ارزاں سمجھتا ہے۔ کشمیر اور فلسطین میں مسلمانوں کی ۷۵ سال سے نسل کُشی کی جا رہی ہے لیکن کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ دوسری جانب انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کے نام سے ایک عیسائی مملکت ۲۰۰۲ء میں اور سوڈان کے دو ٹکڑے کر کے جنوبی سوڈان کے نام سے دوسری عیسائی مملکت ۲۰۱۱ء میں بنا کر اقوامِ متحدہ نے جانب داری اور تعصب کی تمام حدیں پار کر دیں۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے نقشے پر صرف پاکستان اور اسرائیل دو ایسے ممالک ہیں جو مذہب کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئے' لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان بھی عیسائی مذہب کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ آج بھی جو کچھ فلسطین میں ہو رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اقبالؒ سمجھتے تھے کہ مغرب نے مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کیا اور عالَمِ اسلام سے غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ روش اختیار کی۔ اب مسلمانوں کو اسلام کے روشن پہلو اپنانے چاہئیں۔ مغرب کی تعمیر و ترقّی لادینیت کی جانب مائل ہے۔ لوگ اب بے خدا تہذیب کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج اہلِ مشرق بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کے نام پر مذہب' اخلاقیات اور انسانیت سے دور ہو کر مادّہ پرستی اور دُنیاوی عیش و آرام کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیّار بیٹھے ہیں۔

اقبالؒ چاہتے ہیں کہ مسلمان باہم متحد ہو کر آگے بڑھیں۔ خود اپنی صنعتیں قائم کریں۔ مغرب کے رحم و کرم پر نہ رہیں بلکہ صنعت و حرفت کے میدان میں خود ترقی حاصل کریں۔ اب

وقت آ گیا ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ بیدار ہو اور دُنیا کی قیادت کرے تا کہ اسلام کے زرّیں پہلو ساری دُنیا پر آشکار ہو سکیں۔

## مصادر و مراجع


(۱) اقبال، علّامہ ڈاکٹر، مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

(۲) پاریکھ، رؤف، ڈان اخبار، ۸ نومبر ۲۰۲۱ء

(۳) نظامی، قیوم، زندہ اقبال، صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار، لاہور، جون ۲۰۲۲ء

(۴) اقبال، علّامہ ڈاکٹر، مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

(۵) اقبال، علّامہ ڈاکٹر، مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

(۶) اقبال، علّامہ ڈاکٹر، مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

(۷) اقبال، علّامہ ڈاکٹر، نظم، شام و فلسطین، ضربِ کلیم


❁❁❁


**ہماری ویب سائٹ**

**www.tanzeem.org**

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات

☆ تلاوتِ قرآن، دروسِ قرآن، دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس، سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

# لقمان حکیم کی وصیتیں (۴)

مقصود الحسن فیضی

## پانچویں اور چھٹی وصیت: نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمٰن:۱۷)

''(میرے بیٹے! لوگوں کو) نیکی کا حکم دو اور (انہیں) برائی سے روکو۔''

اس وصیت میں دراصل یہ تربیت کی جارہی ہے کہ صرف خود نیک بن جانا' اپنا عقیدہ درست کر لینا اور خود عبادات کا اہتمام کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ ہر معروف' جس میں سرفہرست توحید اور نماز ہے' لوگوں کو اس کا حکم دیا جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے۔ اسی طرح ہر منکر (برائی) سے' جس میں سرفہرست شرک اور نماز کا چھوڑنا ہے' لوگوں کو روکا جائے اور اس کی قباحت اور سنگینی سے انہیں آگاہ کیا جائے۔

اپنی اصلاح کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے' کیونکہ معاشرے کا بہترین فرد وہ ہے جو خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ جو اپنی بھی اصلاح کرے اور دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی عملی کوشش کرے۔ اس وصیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح کرنے والے کو سب سے پہلے اپنا عمل درست کرنا چاہیے تاکہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو پہلے خود توحید اختیار کرنے' شرک سے بچنے' والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور نماز قائم کرنے کی وصیت کی' پھر اسے نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے منع کرنے کی ترغیب دلائی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا شیوہ یہی رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل:۳۶)



''اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسول (اس پیغام کے ساتھ) بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (اُس کے سوا معبودوں) کی عبادت سے بچو۔''

اس فریضے کے ترک کرنے پر بنی اسرائیل اور ان سے پہلے کے لوگوں کی مذمت کی گئی۔

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ﴾ (هود:۱۱۶)

''پس کیوں نہ تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ایسے اہل خیر لوگ ہوئے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے' سوائے ان چند کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی۔''

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ (المائدة)

''انہیں (یہود کو) ان کے عابد اور عالم جھوٹی باتیں کہنے اور حرام مال کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ بے شک وہ بہت برا کر رہے ہیں۔''

جن لوگوں نے اس فریضے کی ادائیگی میں غفلت برتی' انہیں رسوا کن عذاب کا سامنا کرنا پڑا:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ (الاعراف)

''پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو تو (عذاب سے) بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے اور ظالموں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔''

اس اُمّت کی افضلیت اور خیریت بھی اسی فریضے کی مرہونِ منّت ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کرنا بڑی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَثَلُ القَائِمِ عَلٰى حُدُودِ اللّٰهِ وَالوَاقِعِ فِيهَا، كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوا عَلٰى سَفِينَةٍ، فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلاهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، فَكَانَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ المَاءِ مَرُّوا عَلٰى مَنْ فَوْقَهُمْ، فَقَالُوا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِي نَصِيبِنَا خَرْقًا وَلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ يَتْرُكُوهُمْ وَمَا أَرَادُوا هَلَكُوا جَمِيعًا، وَإِنْ أَخَذُوا عَلٰى أَيْدِيهِمْ نَجَوْا، وَنَجَوْا جَمِيعًا))(۳۸)

''اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور انہیں پامال کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے ایک کشتی پر سوار ہونے کے لیے قرعہ اندازی کی' پس ان میں سے کچھ اس کے اوپر والے حصے پر سوار ہو گئے اور ان میں سے بعض کشتی کے نچلے حصے میں سوار ہو گئے۔ نچلے حصے والے جب پانی لینے کے لیے آتے تو اوپر والوں کے پاس سے گزرتے' اس پر انہوں نے کہا: (پانی لینے کے لیے) اگر ہم اپنے حصے کی جگہ میں سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو (بار بار آنے جانے سے) تکلیف بھی نہ دیں (تو یہ بہتر ہوگا)' اب اگر تو اوپر والوں نے انہیں ان کے ارادے اور حال پر چھوڑ دیا تو سب ہلاک ہوں گے' اور اگر انہوں نے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیا تو سب نجات پا جائیں گے۔''

## ساتویں وصیت: صبر کا حکم

توحید اور شرک سے اجتناب پر ثابت قدمی' والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک' نماز قائم کرنے' نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے لیے چونکہ صبر و عزیمت کی سخت ضرورت ہوتی ہے اس لیے حضرت لقمان نے اپنے لختِ جگر کو اس کی خصوصی وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ﴾ (لقمٰن:۱۷)

''اور تمہیں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔''

اس مقام پر صبر کی وصیت دو اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے:

(۱) مذکورہ فرائض کی ادائیگی بغیر صبر کے ممکن نہیں ہے' اس لیے یہ حکم دیا گیا۔ اس صبر کو الصبر على أوامر الله اور الصبر عن معصية الله کہا جاتا ہے۔ سورۃ العصر میں یہی صبر زیادہ واضح ہے' یعنی اللہ کے فرامین کی ادائیگی پر صبر اور اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رکنے پر صبر۔



(۲) مذکورہ فرائض کی ادائیگی' خاص طور پر بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے پر لوگوں کی طرف سے ایذاء اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا' جس کے لیے صبر بہت ضروری ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۱۸۶﴾ (آل عمران)

''یقیناً تمہیں تمہارے مالوں اور جانوں میں آزمایا جائے گا' اور تم یقیناً ان لوگوں کی جانب سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرکین کی جانب سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اور اگر تم صبر کرو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو بے شک یہ ہمت و عزم کا کام ہے۔''

تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے سچے پیروکاروں کو اس سلسلے میں کس قدر تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گویا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نبی کی حالت بیان کر رہے ہیں' جنہیں ان کی قوم نے مار مار کر لہولہان کر دیا' وہ اپنے چہرے سے خون کو صاف کر رہے تھے اور یہ بھی کہہ رہے تھے:

((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ))

''اے اللہ! میری قوم کو بخش دے' یہ مجھے نہیں جانتے۔''(۳۹)

اسی لیے اسلام میں صبر کی بڑی اہمیت ہے اور اس پر ترغیب دی گئی ہے۔

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۱۰﴾ (الزمر)

''بے شک (اللہ کی راہ میں) صبر کرنے والوں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر دیا جائے گا۔''

نیز فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۷۵ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۷۶﴾ (الفرقان)

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بالا خانے دیے جائیں گے' جہاں انہیں دُعا سلام پہنچایا جائے گا۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' وہ بہت ہی اچھی جگہ اور عمدہ مقام ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے صبر کی فضیلت کچھ اس طرح سے بیان فرمائی:

((وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ مَا رُزِقَ عَبْدٌ شَيْئًا أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ))(۴۰)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے' بندے کو صبر سے زیادہ بہتر اور عمدہ کوئی بھی چیز نہیں دی گئی۔''

## آٹھویں وصیت: لوگوں کے ساتھ حسن سلوک

(لوگوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے عاجزی اختیار کرنا)

حضرت لقمان نے بیٹے کی تربیت کو صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رکھا' بلکہ اسے دوسروں کے ساتھ رہنے اور معاشرے کے لوگوں کے ساتھ میل جول کے آداب بھی سکھلائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ (لقمٰن:۱۸)

''اور لوگوں سے اپنا چہرہ پھیر کر بات نہ کر''

یعنی ''لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا''

مراد یہ ہے کہ جب لوگوں سے بات کرو یا وہ تم سے بات کریں تو انہیں حقیر سمجھ کر اور تکبر کی وجہ سے ان سے منہ پھیر کر بات نہ کرو۔ ان کے ساتھ بات کرنے میں نرمی' محبت اور خوش روئی سے پیش آؤ۔ ان کی طرف متوجہ رہو تاکہ وہ خوشی محسوس کریں۔ مسکرا کر بات کرو تاکہ لوگ تمہاری طرف مائل ہوں۔ لوگوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار نہ کرو جو گھمنڈی اور متکبر لوگوں کا ہوتا ہے' بلکہ ان کے ساتھ عاجزی سے پیش آؤ۔ قرآن مجید کا حکم یہی ہے:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرۃ:۸۳)

''اور لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو!''

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اسی کی تعلیم دی۔ حضرت ابوذر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ))(۴۱)

''اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔''



اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ))(۴۲)

''تمہارا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرانا (یہ بھی) صدقہ ہے (یعنی اس کا اجر صدقہ کی طرح ہے)۔''

نبی مکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی یہی تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُقْبِلُ بِوَجْهِهِ وَحَدِيثِهِ عَلَى أَشَرِّ الْقَوْمِ يَتَأَلَّفُهُمْ بِذٰلِكَ، فَكَانَ يُقْبِلُ بِوَجْهِهِ وَحَدِيثِهِ عَلَيَّ حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنِّي خَيْرُ الْقَوْمِ(۴۳)

''رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ برے آدمی کی طرف بھی اپنے چہرے اور گفتگو کے ذریعے متوجہ ہوتے' اس سے آپ ﷺ کا مقصد انہیں مانوس کرنا ہوتا۔ اسی طرح آپ ﷺ اپنے چہرے اور گفتگو کے ساتھ میری طرف اس طرح متوجہ ہوتے حتیٰ کہ میں سمجھ بیٹھا کہ (آپ کے نزدیک) لوگوں میں سب سے بہتر میں ہی ہوں۔''

حضرت لقمان حکیم کی اس وصیت میں تواضع کی ترغیب جبکہ تکبّر سے ممانعت ہے۔ حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

((وَإِنَّ اللهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِي أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ))(۴۴)

''اور اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی ہے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ عاجزی اختیار کرو' حتیٰ کہ کوئی کسی دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی دوسرے پر سرکشی (زیادتی) پر اتر آئے۔''

تواضع سے عزت حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں مقام بڑھتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ))(۴۵)

''اور جو شخص اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے بلند کر دے گا۔''

## نویں وصیت: زمین پر اکڑ کر مت چلو

حضرت لقمان نے بیٹے کو چلنے کے آداب سکھاتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾﴾ (لقمٰن)

''اور زمین پر اکڑ کر مت چلو (کیونکہ) بے شک اللہ تعالیٰ خود پسند اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ﴿٦٣﴾﴾ (الفرقان)

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی اور عاجزی سے چلتے ہیں' اور جب نادان لوگ ان کے منہ لگتے ہیں تو وہ سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾﴾ (الاسراء)

''اور زمین پر اکڑ کر مت چلو' یقیناً تم (اپنی متکبرانہ چال سے) زمین کو ہرگز نہیں پھاڑ سکتے اور نہ ہی پہاڑوں کی اونچائی کو پہنچ سکتے ہو۔''

آخرت میں بلندیاں متواضع اور نرم خو لوگوں کے لیے ہیں۔ متکبر اور شیخی بگھارنے والوں کے لیے آخرت میں کوئی مقام نہیں ہے۔

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٨٣﴾﴾ (القصص)

''آخرت کا گھر ہم ان ہی لوگوں کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جو نہ تو زمین پر اپنی بڑائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس میں فساد پھیلانے کی چاہت رکھتے ہیں۔ پرہیزگاروں کے لیے نہایت عمدہ انجام ہے۔''

یہ آیت قارون کے قصے پر بطور تبصرہ وارد ہوئی ہے۔ گویا قارون کے اپنے خزانہ سمیت زمین میں دھنسنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دنیا کی زندگی کو مقدم رکھا اور تکبر سے کام لیا۔



تکبر ایسا قبیح فعل ہے کہ بسا اوقات اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي فِي حُلَّةٍ، تُعْجِبُهُ نَفْسُهُ، مُرَجِّلٌ جُمَّتَهُ، إِذْ خَسَفَ اللّٰهُ بِهِ، فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ))[٤٦]

''ایک وقت ایک آدمی ایک جوڑے میں ملبوس چلا جا رہا تھا' اس کے نفس نے اس کو خود پسندی میں مبتلا کر دیا تھا' بالوں میں کنگھی کیے ہوئے تھا (اپنی حالت پر اترا رہا تھا) کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا' پس وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔''

اکڑ کر چلنے والے کے لیے قیامت کے دن بھی بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ تَعَظَّمَ فِي نَفْسِهِ، أَوِ اخْتَالَ فِي مِشْيَتِهِ لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ))[٤٧]

''جس نے خود کو بہت بڑا سمجھا اور اکڑ اکڑ کر چلا' تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ ناراض ہوگا۔''

## دسویں وصیت: میانہ روی اختیار کرو اور آواز کو پست رکھو

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو مزید کچھ معاشرتی آداب سکھاتے ہوئے وصیت کرتے ہیں:

﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾﴾ (لقمٰن)

''اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو' اور اپنی آواز پست رکھو۔ یقیناً آوازوں میں بدتر آواز گدھوں کی ہوتی ہے۔''

اس وصیت میں دو آداب کی طرف رہنمائی کی گئی ہے:

(۱) میانہ روی اختیار کرو' یعنی اپنی رفتار میں یا اپنے تمام امور میں میانہ روی اختیار کرو۔ چلنے میں رفتار ایسی ہو کہ نہ تو انسان گنواروں کی طرح دوڑ رہا ہو کہ جس سے خود کو تکلیف اور دوسروں کو ضرر پہنچ سکتا ہو اور نہ چال اس قدر دھیمی ہو کہ بندہ مریض' مریل اور ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا ہو۔ حضرت

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا مَشٰى كَأَنَّهُ يَتَوَكَّأُ (۴۸)

''نبی ﷺ جب چلتے تو ایسا لگتا کہ آگے کو جھک جاتے ہیں۔''

چلنے کی اس کیفیت کی دو علامتیں ہوتی ہیں: (۱) آدمی سینہ تان کر اور آہستہ آہستہ نہیں چلتا۔ (۲) چلتے وقت رفتار قدرے تیز رہتی ہے۔ اس کی تفصیل دوسری حدیث میں اس طرح وارد ہے' حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ أَبْيَضَ مَلِيحًا ، إِذَا مَشٰى كَأَنَّمَا يَهْوِي فِي صَبُوبٍ (۴۹)

''آپ ﷺ سفید رنگ اور انتہائی خوبصورت تھے' اور جب چلتے تو لگتا تھا کہ اوپر سے نیچے کی طرف اتر رہے ہوں۔''

جب کوئی آدمی اوپر سے نیچے اتر رہا ہو تو تین کیفیات کا ظاہر ہونا ضروری ہے: (۱) سینہ تان کر فخر سے نہیں چل سکتا۔ (۲) بہت آہستہ آہستہ بھی نہیں چلتا۔ (۳) دوڑ کر بھی نہیں چل سکتا کیونکہ گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی چال میں شریف اور ایک باعزت شخصیت کا مالک ظاہر ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ سروں کو جھکائے ہوئے دھیمی دھیمی چال چلتے ہوئے جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنا کوڑا تانا اور فرمایا:

ارفع رأسك، لا تمت علينا ديننا

''اپنا سر اونچا کر کے چلو' اور ہمارے دین کو کمزور نہ کرو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہودیوں کی اکھڑی تیز چال اور نصاریٰ کی چیونٹیوں جیسی چال سے روکا جاتا تھا۔ (۵۰)

(۲) آواز کو پست رکھو' یعنی اسے ضرورت یا حد سے زیادہ اونچا نہ کرو' کیونکہ آوازوں میں بدتر آواز گدھوں کی ہوتی ہے۔ آواز اس قدر آہستہ بھی نہ ہو کہ سامنے والے کو سنائی نہ دے اور اس کی سمجھ میں نہ آئے' بلکہ درمیانہ آواز کے ساتھ بات کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۝۱۱۰﴾ (الاسراء)



''اور آپ اپنی نماز نہ تو زیادہ اونچی آواز سے پڑھیں اور نہ ہی بالکل پست آواز سے' بلکہ ان دونوں کے درمیان کا طریقہ اختیار کریں۔''

جب نماز میں مناسب اور درمیانی آواز اختیار کرنے کا حکم ہے تو عام باتوں میں اس کا اور بھی زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ بلاضرورت ہر جگہ خصوصاً بازاروں اور عوامی مقامات پر آواز کو بلند کرنا' چیخنا اور چلّانا بے ادبی کی بات ہے۔ ہر ماحول میں اسے بُرا تصور کیا جاتا ہے' خاص طور پر اگر اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے تو اس کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو بے عقل قرار دیا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝۴﴾ (الحجرات)

''(اے نبی ﷺ!) بے شک جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔''

اسی طرح لوگوں میں اپنا بڑا پن ظاہر کرنے' دھونس جمانے یا تکلفاً گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز کا بلند کرنا بھی بداخلاقی ہے۔ اگر آواز کا بلند ہونا کوئی عمدہ چیز ہوتی یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوتی تو گدھے کی آواز کو برا اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار نہ دیا جاتا۔

البتہ بعض حالات ایسے ہیں جہاں آواز کا بلند کرنا پسندیدہ ہے' جیسے اذان میں' تلبیہ پڑھتے ہوئے اور خطبہ کے دوران وعظ و نصیحت وغیرہ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے اذان کا خواب دیکھنے کے واقعہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن زید سے فرمایا:

((إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ، فَقُمْ مَعَ بِلَالٍ فَأَلْقِ عَلَيْهِ مَا رَأَيْتَ ، فَلْيُؤَذِّنْ بِهِ، فَإِنَّهُ أَنْدَى صَوْتًا مِنْكَ)) (۵۱)

''ان شاء اللہ یہ خواب حق ہے' اٹھو اور جو خواب دیکھا ہے اسے بلال کو سکھلا دو' تاکہ وہ اذان دیں' کیونکہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں۔''

تلبیہ میں آواز بلند کرنے سے متعلق متعدد حدیثیں وارد ہیں۔ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((جَاءَنِي جِبْرِيلُ ، فَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ ، مُرْ أَصْحَابَكَ فَلْيَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ

بِالتَّلْبِيَةِ، فَإِنَّهَا مِنْ شِعَارِ الْحَجِّ))(۵۲)

"میرے پاس جبریل آئے اور بولے: اے محمد (ﷺ)! اپنے صحابہؓ سے کہو کہ تلبیہ بآواز بلند پکاریں‘ اس لیے کہ یہ حج کا شعار ہے۔"

خطبہ سے متعلق حدیث حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ ، وَعَلَا صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتّٰى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُولُ صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ (۵۳)

"رسول اللہ ﷺ جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں‘ آواز بلند اور لہجہ سخت ہو جاتا‘ گویا کہ آپ ﷺ کسی (حملہ آور) لشکر سے ڈرانے والے اس شخص کی طرح ہیں جو کہہ رہا ہے کہ دشمن تمہارے اوپر صبح کو حملہ کرنے والا ہے‘ شام کو حملہ کرنے والا ہے!"

## وصیتوں سے ماخوذ فوائد

لقمان حکیم کی مذکورہ وصیتوں میں بے شمار تربیتی و اصلاحی اسباق و فوائد موجود ہیں۔ چند ایک بطور نمونہ ذیل کی سطور میں پیش ہیں‘ جن میں سے اکثر فوائد الشیخ مصطفیٰ العدوی کی کتاب "موعظة لقمان لولده" سے ماخوذ ہیں۔

(۱) یہ لقمان حکیم کی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر خیر رکھا‘ انہیں حکیم قرار دیا اور انہیں یہ مقام و مرتبہ عطا فرمایا کہ لوگ اپنی اولاد کی تربیت میں ان کو اُسوہ تسلیم کریں۔ ان وصیتوں کے ذکر کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ اہلِ ایمان اپنی اولاد (مذکر و مؤنث) کی تربیت انہی اصولوں پر کریں۔

(۲) کسی بندے کو جو بھی نعمت ملتی ہے وہ صرف اور صرف اللہ کی طرف سے عطیہ اور اس کا فضل ہوتا ہے۔ چنانچہ عالم کا علم‘ حکیم کی حکمت اور مالدار کا مال رب کائنات کا عطیہ ہے۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾

اسی طرح ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ (النحل:۵۳)

"تمہیں جو نعمت بھی ملی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے۔"

(۳) اللہ کی نعمتوں اور اس کے عطایا پر اُس کا شکر واجب ہے‘ جیسے فرمایا:



﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ﴾

"اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ شکر کرو اللہ کا!"

(۴) انسان کے شکر کرنے اور عبادت کرنے کا فائدہ اسی کو ملنے والا ہے‘ اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے۔

(۵) والدین کے لیے مستحب ہے کہ اپنے بچوں کو عمل خیر کی وصیت و نصیحت کرتے رہیں‘ جیسا کہ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنّت رہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضرت نوح‘ حضرت یعقوب اور اسماعیل علیہم السلام کی نصیحتوں اور وصیتوں کا ذکر ملتا ہے۔

(۶) ایک مربی کو تربیت کے لیے کیسا انداز اختیار کرنا چاہیے‘ اس کے بارے میں مکمل رہنمائی کی گئی ہے۔ جیسے:

(i) تربیت کرنے والے کو وعظ کا اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔ تعلیم و تربیت کے لیے یہ اسلوب انتہائی مؤثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لقمان حکیم کے بارے میں فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ﴾ (لقمٰن:۱۳)

"اور (اس وقت کو یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو وعظ (نصیحت) کرتے ہوئے فرمایا"

"وعظ" کی تعریف کرتے ہوئے ابن سیدہؒ فرماتے ہیں:

"هُوَ تَذْكِيْرُكَ لِلْاِنْسَانِ بِمَا يُلَيِّنُ قَلْبَهُ مِنْ ثَوَابٍ وَعِقَابٍ" (۵۴)

"وعظ کا معنی یہ ہے کہ آپ کسی بندے کو ثواب اور سزا کا ذکر کر کے ایسی چیز کی نصیحت کریں جو اُس کے دل کو نرم کر دے۔"

اسی طرح تربیت کرنے میں شفقت کا پہلو غالب ہو۔ مربّی کا انداز ایسا ہو کہ سامنے والا یہ سمجھے کہ تربیت کرنے والا ہمارا ہمدرد ہے اور ہماری بھلائی چاہتا ہے۔ محض ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکنے کا انداز اختیار کرنے سے تربیت صحیح بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً موجودہ دور میں نوجوان نسل کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے‘ ان کے لیے مناسب اندازِ تربیت اختیار کرنا بہت ہی ضروری ہے‘ وگرنہ ان کے ضیاع کا خدشہ ہے۔

(ii) ایسا محبت بھرا انداز اختیار کرنا چاہیے کہ جس کی تربیت کی جا رہی ہے اس کی ساری توجہ مربّی کی طرف مبذول ہو جائے‘ جیسا کہ حضرت لقمان کے بار بار اپنے بیٹے کو یَابُنَیَّ (اے

میرے پیارے بیٹے!) کہنے سے معلوم ہو رہا ہے۔

(iii) تربیت کرنے والے کو چاہیے کہ ضرورت پڑنے پر اپنی بات کی دلیل بھی ذکر کرے اور جس کی تربیت کر رہا ہے اس پر واضح کرے کہ میں نے فلاں بات فلاں سبب کی بنا پر کہی ہے' جیسا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ (لقمٰن:۱۵)

''اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کر کے اسے حمل میں رکھا' اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے۔''

(iv) مربّی کو چاہیے کہ جس چیز سے منع کر رہا ہے اس کی قباحت اور اس کے باعث نفرت ہونے کی علت بھی واضح کرے' جیسا کہ حضرت لقمان نے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ (لقمٰن:۱۸)

''اور لوگوں سے اپنا چہرہ پھیر کر بات نہ کرو۔''

اس اندازِ گفتگو کو معاشرے میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح بلاضرورت آواز بلند کرنے کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دینا کہ بیٹا اس سے کراہت محسوس کرے۔

﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾﴾ (لقمٰن)

''اور اپنی آواز پست رکھو' یقیناً آوازوں میں بدتر آواز گدھوں کی ہوتی ہے۔''

(v) اسلوبِ تعزیز: اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی بات کہتے ہوئے یا کسی چیز کو حکم دیتے ہوئے ایسی بات بھی ذکر کی جائے کہ جس سے اولاد کو وہ کام کرنے کی تقویت ملے' اس کے حوصلے بلند ہوں اور اس کی ہمت میں مزید اضافہ ہو۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نماز قائم کرنے' نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا:

﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمٰن)

''بے شک یہ (مذکورہ) کام پختہ امور میں سے ہیں۔''

(۷) شرک کی قباحت کہ وہ علی الاطلاق ''ظلمِ عظیم'' ہے۔

(۸) والدین کے حقوق کی اہمیت' خصوصاً والدہ کا عظیم مقام۔

اس عمل پر بعض انبیاء علیہم السلام کی تعریف کی گئی ہے' جیسے حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام۔



(۹) مدّتِ رضاعت دو سال ہے۔ یعنی اس مدت کے بعد اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو اس پر رضاعت کے احکام مترتب نہیں ہوں گے' البتہ یہ جائز ہوگا کہ وقت ضرورت کوئی عورت اپنے بچے کو دو سال سے زائد بھی دودھ پلا سکتی ہے۔

(۱۰) والدین کافر ہی کیوں نہ ہوں' ان کے ساتھ ان کے حسنِ صحبت کا حق باقی رہتا ہے۔

(۱۱) ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت میں توحید اور شرک کا مسئلہ سب سے مقدم رکھا جائے۔ بچوں کے دل میں اس موضوع کی اہمیت بٹھائی جائے تاکہ شیطان انہیں آسانی سے بھٹکا نہ سکے اور ان کی صاف و شفاف فطرت کو آلودہ نہ کر سکے۔

(۱۲) حضرت لقمان نے صرف توحید الوہیت اور توحید اَسماء وصفات کے بارے میں نصیحت کی' کیونکہ توحید کا کوئی منکر نہیں ہے۔ البتہ موجودہ زمانے میں بچوں کو توحید ربوبیت سے بھی مکمل طور پر آگاہ کرنا چاہیے' کیونکہ آج لوگ شرک کی اس قسم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

(۱۳) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے' خواہ وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔

(۱۴) اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جائے۔ اطاعت اور سلوک دونوں الگ الگ چیزیں ہیں' جیسے والدین اگر شرک کے لیے مجبور کریں تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی' البتہ ان کے احترام کے تقاضوں کو پورا کیا جائے گا اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو مدِنظر رکھا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۪ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (لقمٰن)

''لیکن اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تم کسی اور کو شریک کرو جسے تم نہیں جانتے' تو تم ان کی بات ہرگز نہ مانو' البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو' مگر پیروی اُس شخص کے راستے کی کرو جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔''

(۱۵) مؤمن کو چاہیے کہ اپنے لیے ایسے لوگوں کو اُسوہ اور آئیڈیل بنائے جو صاحبِ فضل اور متقی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ﴾ (لقمٰن:۱۵)

''اور اُس کی راہ پر چلو جو میری طرف رجوع کرنے والا ہے۔''

(۱۶) نماز اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت' اور یہ فریضہ بہت پرانا ہے۔

(۱۷) انسان کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ خود نیک بن جائے' بلکہ کمال یہ ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ وہ دوسروں کی بھی اصلاح کرے۔ اگر اس نے صرف اپنی اصلاح پر توجہ دی اور دوسروں کی اصلاح نہ کی تو وہ خود بھی نہیں بچ پائے گا۔

(۱۸) اسلام میں اخلاقیات کو بڑا مقام حاصل ہے۔ انسان کی شخصیت اُس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنے عقائد' عبادات اور معاملات کے ساتھ اپنے اخلاق کو بھی درست نہ رکھے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((إِنَّمَا بُعِثْتُ لأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلاقِ)) (۵۵)

''مجھے تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔''

جس قدر بندے کا اخلاق اچھا ہوگا اسی قدر اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا، أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) (۵۶)

''مؤمنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔''

(۱۹) فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فضیلت' نیز یہ کہ نماز قائم کرنے کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)

''جن لوگوں کو ہم نے زمین میں اقتدار دیا انہوں نے نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دی' نیکی کا حکم دیا اور بُرائی سے منع کیا۔ اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے لیے ہے۔''

(۲۰) دین اسلام کی خوبی کہ وہ صرف عبادات وعقائد ہی نہیں بلکہ اچھے اخلاق وعادات کی بھی ترغیب دیتا ہے' حتیٰ کہ وہ راستہ چلنے اور لوگوں سے مخاطب ہونے کے آداب بھی سکھلاتا ہے۔

(۲۱) بزرگان دین اور اللہ کے نیک بندوں کے واقعات بیان کرنا اور ان میں عبرت ونصیحت کے پہلو اُجاگر کرنا مستحب اور اچھی چیز ہے۔



## حواشی

(۳۸) صحيح البخاري: ۳۴۷۷ ، صحيح مسلم: ۱۷۹۲

(۳۹) مسند أحمد ۱۷ / ۱۵۵ ، سنن ابی داود: ۱۶۴۴ ، مستدرک حاکم ۲/ ۴۴۹ بروایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ' الفاظ ابن حبان کے ہیں۔

(۴۰) مسند أحمد ۳۵/ ۲۸۴ ، سنن الترمذی: ۱۹۸۷ ، سنن الدارمی: ۲۷۹۱۔

(۴۱) سنن الترمذي: ۱۹۵۶ ، الادب المفرد: ۸۹۱ ، صحيح ابن حبان: ۴۷۴ بروایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ

(۴۲) مختصر الشمائل للترمذي: ۴۲۹۵

(۴۳) صحيح مسلم: ۲۸۶۵ ، سنن ابن ماجه: ۴۱۷۹

(۴۴) صحيح مسلم: ۲۵۸۸ ، سنن الترمذی: ۲۰۲۹ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

(۴۵) صحيح البخاري: ۵۷۸۹' صحيح مسلم: ۲۰۸۸

(۴۶) مسند أحمد ۱۰/ ۲۰۰ ، الادب المفرد: ۵۴۹

(۴۷) سنن أبي داود: ۴۸۶۳ ، سنن الترمذی: ۱۷۵۴ ، مسند ابی یعلی: ۳۷۶۴

(۴۸) سنن أبي داود: ۴۸۶۴

(۴۹) تيسير الرحمن لبيان القرآن ، دكتور لقمان السلفی

(۵۰) سنن ابو داود: ۴۹۹ ، سنن الترمذی: ۱۸۹ ، صحيح ابن خزيمة: ۳۶۳

(۵۱) سنن ابن ماجة: ۲۹۲۳ ، صحيح ابن خزيمة: ۲۶۲۹ ، مسند احمد ۵/ ۱۹۲

(۵۲) صحيح مسلم: ۸۶۷ ، سنن النسائي: ۱۵۷۷ ، سنن ابن ماجة: ۴۵

(۵۳) لسان العرب ، ۷/ ۴۶۶

(۵۴) مسند أحمد ۱۴ / ۵۱۲ ، الادب المفرد: ۲۷۳ مسند البزار ۱۵ / ۳۶۴ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ الفاظ مسند البزار کے ہیں۔

(۵۵) مسند أحمد ۱۶/ ۴۷۸ ، سنن ابی داود: ۴۶۸۲ ، سنن الترمذي: ۱۱۶۲

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# اکیسویں صدی میں فکرِ اقبال کی اہمیت

علیزہ عبدالقادر نظامانی ☆

حقیقی مفکّرین کی فہرست میں اوّلین درجہ اُن کو حاصل ہے جن کی ساری تگ و دو ممکنہ حد تک حق کو باطل سے ایسے جدا کرنے میں لگے کہ حقیقت کا پردہ تو چاک ہو جائے مگر اس کے دامن پر باطل کا کوئی دھبا بھی نہ آنے پائے۔ یہاں یہ سوال قدرتی طور پر اُٹھتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا! مسلمانوں کے لیے حق وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے اور باطل وہ جس کے مخالف آپ ﷺ نے جِدّ و جُہد کی۔ اس سے قطع نظر منطقی طور پر اس کا جواب یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ حق وہی ہے جو مخلوق کی فطرت کے عین مطابق ہو جبکہ باطل وہ جس کے نتائج فطرت کے عین برعکس ہوں۔

مفکّرین کی اس قبیل کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ محض انسان کی فطرت ہی کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی ایسی کاوشیں تمام مخلوقات پر محیط ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی انسان جب اپنی فطرت پر ہوتا ہے تو ہر چیز اعتدال کے دائرے میں سمیٹ کر رکھتا ہے اور اگر فطرت سے ہٹ جائے تو تمام اشیاء و انتظامات کو درہم برہم کر دیتا ہے جس کا اثر دوسری مخلوقات پر بھی پڑتا ہے۔

ہر دور میں بساطِ باطل پر حق کے مہرے ضرور اُٹھتے ہیں جو سچ کا پرچم اپنے افکار کی شکل میں بلند کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مردِ مجاہد بیسویں صدی میں نمودار ہوا جس کی فکر اکیسویں صدی تو کیا آنے والی کئی صدیوں پر محیط ہے۔ اُن کا اسمِ گرامی علّامہ محمد اقبال رحمہ اللہ ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن کا فکری ارتقاء مسلسل آگے بڑھتا رہا، اور بڑھتے بڑھتے مغربی فکر سے جا ٹکرایا۔ پھر راز یہ کھلا کہ آج کا سب سے بڑا بت مغرب کا تراشا ہوا ہے جو دھیرے دھیرے تمام انسانوں کو نگوں کر دے گا۔ علّامہ اقبال بھانپ گئے کہ اس کے اثرات مغرب تک ہرگز

☆ اے ڈی ایس (سال دوم)، ٹنڈو محمد خان، حیدرآباد (سندھ)



محدود نہیں ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ یہ پوری دنیا کے ہر میدان تک رسائی حاصل کر لے گا۔ دورِ اقبال سے دورِ حاضر تک، اُمّتِ مُسلمہ کو علّامہ صاحب کا پیغام بہت واضح اور دوٹوک ہے کہ:

اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

اقبال نصیحت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ بات پوری طرح ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ اقوامِ مغرب کی پیروی اور اُن کے طرزِ حیات کی مانند اپنا طرزِ حیات تشکیل دینے میں اُمّت کی بقا نہیں بلکہ موت ہے۔ اقوامِ مغرب کا مرکز و محور اپنی جغرافیائی حدود کا تحفظ ہے۔ اُن کا کوئی ایک مذہب یا خدا نہیں جس کے قوانین کے مطابق وہ زندگی بسر کریں بلکہ ہر دن اُن کے لیے ایک نیا خدا تراشتا ہے۔ طاغوت کے پجاری زمانے ہی کی پرستش کیا کرتے ہیں جبکہ ہر دور کا اپنا طاغوت ہوتا ہے۔ مغربی نظریات اپنی اصل میں نہایت ہی خام ہیں کیونکہ گردشِ ایام کا دریا انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا استحکام اُس مذہب میں ہے جو رسولِ ہاشمی ﷺ لے کر آئے۔ یہ زمان و مکاں کی حدود میں مقید نہیں۔ یہی واحد قوت و طاقت ہے جو اُمّتِ مُسلمہ کے استحکام کو قائم رکھ سکتی ہے۔ اسی کی قائم کردہ فصیلیں ہیں جن کے دائرے میں زندگی بسر کر کے مسلمان اپنی اصلی شناخت کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

## تصوّف اور فکرِ اقبال

علّامہ اقبال نے جہاں مغربی افکار کی وبا کی تشخیص کی وہاں اُمّت کے کئی ایسے امراض کو بھی معیّن کیا جو مسلمانوں نے اسلام کے نام پر ایجاد کر رکھے ہیں۔ ان میں نمایاں کردار فلسفۂ تصوّف کا ہے۔ بقول اقبال، اس نام نہاد فلسفہ نے مسلمانوں کے ذہنوں کو جمود کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔ اس کے باعث اُن کے اجسام و اذہان ساکت ہو کر رہ گئے ہیں۔ علّامہ نے یہ پیغام کہیں اشعار، کہیں مقالوں تو کہیں خطوط کی شکل میں پہنچایا ہے۔ تصوف کی موجودہ شکل کی اُنہوں نے سخت الفاظ میں تردید کی ہے اور اُسے خلافِ اسلام قرار دیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں علّامہ نے لکھا: ''تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا

ہے‘ جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔‘‘

’’بالِ جبریل‘‘ میں بندۂ مومن اور پیروکارِ تصوّف کا تقابل یوں کرتے ہیں: ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

بندۂ مؤمن کی بلند تکبیریں آسمان کو چھو رہی ہیں اور کونے میں تسبیح کرتا ہوا بندہ خاک کی آغوش میں سکون سے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے۔ بندۂ مؤمن کے لیے اصل ہدف حق کا نعرہ بلند کرنا ہے۔ کُرّۂ ارض پر ناانصافی کو برداشت کرنا بندۂ مؤمن کے شایانِ شان نہیں۔ ولی اللہ کا کام محض اللہ اللہ کرنے تک محدود نہیں بلکہ اسے عزیمت کے راستوں کو لبیک کہنا ہے۔

نام نہاد تصوّف کے علاوہ اقبال نے رسوم و رواج کے نام پر قائم ان بدعتوں پر بھی تنقید کی جنہوں نے حقائق کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی!

’’ضربِ کلیم‘‘ میں فرمایا:

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ‘ کیا مدرسے والوں کی تگ و دو!

بقول اقبال‘ عجمیوں سے اخذ کی گئی روایات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ تمام خرافات پر مبنی ہیں‘ جن سے اپنا دامن بچا کر چلنے سے ہی حقیقت آشکار ہوگی۔

## فلسفۂ خودی

دورِ حاضر میں تمام مسائل و مصائب کی بنیادی وجہ خود شناسی سے بے اعتنائی ہے۔ انسانوں کی کثیر تعداد اس مرض کی تشخیص کیے بغیر اس کا حل تلاش کرنے میں کوشاں ہے۔ چنانچہ نتیجہ وہی نکلتا ہے جو نکلنا چاہیے۔ افکار کی دُنیا میں اس کا بہترین علاج علّامہ صاحب کا فلسفۂ خودی ہے جو اُن کے اشعار میں بار بار سامنے آتا ہے۔ سید نذیر نیازی نے اپنے ایک مضمون میں وضاحت کی ہے کہ ایک بار میں علّامہ صاحب کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ آپ کے اس فلسفے کا ماخذ کیا ہے جس کی چہ میگوئیاں ہر خاص و عام میں ہوتی رہتی ہیں! جواباً علّامہ نے بس اتنا کہا



کہ کل فلاں وقت پر آیئے گا‘ میں واضح کر دوں گا۔ چنانچہ مقررہ وقت پر سید نذیر نیازی پنسل کاپی سمیت وہاں پہنچ گئے کہ اس فلسفے کے متعلق تمام اہم باتیں لکھ کر محفوظ کر لینی چاہئیں۔ لیکن اُنہیں اتنی محنت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ علّامہ نے ہدایت کی کہ قرآن مجید اُٹھالاؤ‘ اور پھر سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ کھول کر فرمایا: یہ ہے میرے فلسفۂ خودی کا ماخذ!

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾﴾

’’اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔‘‘

اپنے آپ سے آشنا ہو جانا‘ اپنی اصل حقیقت کو پہچان لینا‘ یہی اقبال کا فلسفۂ خودی ہے۔ اُن کے بیشتر اشعار اسی کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ جیسے ’’بالِ جبریل‘‘ میں لکھا ہے: ؎

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے

علّامہ اپنے مخاطب سے کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمت ہے تو ظاہری عقل سے آشکار ہونے والے حقائق سے ماوراء ہو جاؤ اور اِس خوش فہمی سے باہر نکل آؤ کہ تمہاری ذات اب کامل ہو چکی ہے جسے مزید کسی علم و عمل کی ضرورت نہیں۔ یہ خیالِ خام ہے‘ کیونکہ تمہاری خودی ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے جس میں اَن گنت جزیرے پوشیدہ ہیں۔ کسی ایک جزیرے پر پڑاؤ ڈالنے کے بجائے سفر کرتے رہو۔ اِس بحرِ خودی میں غوطہ زن ہو جاؤ اور اپنا سراغ لگاؤ۔ ’’ساقی نامہ‘‘ میں علّامہ نے اس بات کو یوں بیان کیا کہ گویا دریا کوزے میں بند ہو گیا: ؎

خودی کیا ہے‘ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے‘ بیداریٔ کائنات!

ایک اور جگہ واضح کیا کہ خودی کا چشمہ کہاں ہے: ؎

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

فلسفۂ خودی میں اقبال کا پیغام دوٹوک ہے کہ حق کی طرف بڑھنے کے سفر میں سب سے

پہلا قدم اپنے آپ سے مانوس ہوجانا ہے۔ خدا تک رسائی کے لیے سب سے پہلے خود تک پہنچنا ہوگا۔ خودی کا سرچشمہ قلبِ انسانی ہے جہاں سے اس سفر کی شروعات ہوتی ہے۔ یہیں سے مردِ مجاہد کے سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔

## نظامِ تعلیم

ہر دور میں تعمیرِ کردار، اعلیٰ اخلاق و افکار اور تہذیبی شناخت میں تعلیم کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اسی کے ذریعے مستقبل کے معمار اُٹھتے ہیں۔ طالب علم آئندہ کے اہداف متعین کرتے ہیں۔ اُن کی ذہن سازی ہوتی ہے اور سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

علّامہ اقبال نے جہاں تمام اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، وہاں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اِس اہم موضوع کو نظر انداز کرتے! ان کے اشعار سے واضح ہے کہ وہ اپنے وقت کے نظامِ تعلیم سے بہت مایوس تھے، جبکہ آج اکیسویں صدی میں یہ مرض پہلے سے زیادہ شدید ہو چکا ہے۔ علّامہ اقبال نے محسوس کیا کہ تعلیمی مکاتب ہمارے ذہنوں کو غلامی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''ہندی مکتب'' میں اُنہوں نے اپنے وقت کے نظامِ تعلیم سے بے زاری کا اظہار انتہائی دل سوز انداز میں کیا ہے:

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اِک آن ہے محکوم کا اِک سال
کس درجہ گراں سَیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

علّامہ کی دُور رس نگاہ نے مستقبل کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھ لیا کہ تعلیم جسے نظریات کی



بلندی اور ذہنی آزادی کے لیے پیہم کوشاں رہنا چاہیے، وہ دراصل ذہنی محکومی سکھا رہی ہے۔ جہاں اسلام کے نظریاتی اصول کی شناخت کروانی چاہیے، وہاں نظریاتی نسل کشی ہو رہی ہے۔ اللہ سے فریاد کرتے ہوئے اپنا حال دِل اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

''ضربِ کلیم'' میں ''نصیحت'' کے عنوان سے شیطان کے حربے کو یوں بیان کرتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹّی کا ہے اِک ڈھیر!

آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ واقعتاً ان کی پیشین گوئی کس قدر سچ ثابت ہوئی ہے۔ دُنیا نے دیکھا اقبال کا یہ دعویٰ سچا نکلا کہ

سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو مَیں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو مَیں!

اگر آج بھی ہم باریک بینی سے فکرِ اقبال کا مطالعہ کریں تو بلاشبہ اصلاحِ احوال کے ساتھ مستقبل کے نقصانات سے بھی بچ سکتے ہیں۔

## وطن پرستی اور قوم پرستی

اکیسویں صدی میں اُمّتِ مُسلمہ انتشار اور مغلوبیت کے جس نچلے درجے میں جا گری ہے اس کی بنیادی وجہ وطن پرستی ہے۔ وطن پرستی و قوم پرستی بظاہر تو بہت خوش کن اصطلاحات ہیں مگر درحقیقت یہ دل فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں! اگرچہ اقبال بھی ابتداءً وطن پرستی کی طرف مائل تھے اور اسی وطن پرستی کی دل فریب ادا میں گم ہو کر اُنہوں نے ایسے اشعار لکھے جن کی بدولت انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن حصولِ تعلیم کی خاطر ولایت جانے کے بعد اُن کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا۔ وہی اقبال جو کل وطن پرستی کا درس دیتا تھا، آج اس کو مذہب کا قاتل کہنے لگا۔ جس اقبال نے کل کہا تھا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا!
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا!

آج وہی اقبال یہ کہنے لگا:؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

دیارِ مغرب میں رہ کر اُنہوں نے فرنگیوں کے نظریات کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور یہ جانا کہ وطن پرستی کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانوں کی کھینچی گئی یہ سرحدیں اور منتخب کیے گئے الگ الگ پنجرے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ''بانگِ درا'' میں ''وطنیت'' کے عنوان تلے لکھے اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اقبال نے اِس پر کس قدر تنقید کی ہے:؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کے جڑ کٹتی ہے اس سے

وطنیت اُمّت کو بانٹ دیتی ہے۔ اتحاد کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ ایک ملک کے ذخائر بس اُسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مادی وسائل کیا، احساسات و جذبات بھی اپنے دائرہ کار تک ہی محدود ہو جاتے ہیں۔ اُمّتِ واحدہ جسے جسدِ واحد کی حیثیت حاصل ہے، بہت سی شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایسے میں مسئلہ کشمیر پاک و ہند کا آپسی تنازعہ بن جاتا ہے اور فلسطین کا مسئلہ عرب تک محدود رہ جاتا ہے۔

## پس چہ باید کرد؟

علّامہ اقبال تہذیبِ حاضر کے غافلوں کو زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ پیغام اُس بانگِ درا کی مانند ہے جو سوئے ہوؤں کو بیدار کرنے آتی ہے۔ ظاہری زندگی و موت سے قطع نظر، یہ پیغام حقیقتِ مرگ و حیات ہے۔ بقول اقبال ع ''خدائے زندہ، زندوں کا خدا ہے''، جبکہ زندگی محض ہواؤں میں سانس لینے کا نام نہیں بلکہ پیکرِ خاکی میں جان پھونکنے کا نام ہے۔؎

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!



یہ جان توحید پھونکتی ہے۔ توحید اللہ ربّ العزت کو سب سے برتر و اعلیٰ مان کر اپنا وجود اسے سپرد کرنے کا نام ہے۔ یہی اسلام کا نقطہ آغاز ہے۔ اسی سپردگی کے بعد حقیقی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اقبال یہ پیغام فرد سے افراد تک اور افراد سے ملّت تک پہنچاتے ہیں۔ یہ اقبال کا نمایاں انداز ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر مرض کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ بندۂ مؤمن کو شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے بگاڑ کی وجہ صحبتِ زاغ بتلاتے ہیں:؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

جگہ جگہ شاہین کو اپنی قوتِ پرواز کی یاددہانی کرواتے ہیں:؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں!

اقبال کہتے ہیں کہ فرد کے گناہوں پر اللہ اسے جلد نہیں پکڑتے بلکہ ڈھیل دیتے ہیں مگر جب ملّت اپنے مقصد سے لگاتار روگردانی کرے اور امانتِ خلافت سے انحراف برتے، تو وہ مجموعی طور پر ایک رسوا کن مغلوبیت کا شکار بن جاتی ہے۔؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف!

افراد و ملّت کی بقا کا واحد راستہ مقصدِ حقیقی کی جانب واپسی ہے۔ اس راستے کا نقشہ قرآن ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کا پیغام درحقیقت رجوع الی القرآن ہے۔ اقبال کے اشعار ایک طرح سے قرآن کی تفسیر ہیں۔ دورِ حاضر میں ظلمتِ غفلت نے چہار جانب اندھیرا کر رکھا ہے۔ ہم انفرادی و اجتماعی طور پر پسپا ہو چکے ہیں۔ ایسے حالات میں فکرِ اقبال ایک بہت بڑا اثاثہ ہے۔ یہ ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کی سیر کرواتا ہے اور ہم پر بہت سے پوشیدہ حقائق اور تلبیس ابلیس آشکار کرتا ہے۔ کس قدر سچ کہا تھا جنابِ اقبال نے:؎

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لیے ہے مرا شعلہ نوا، قندیل!

❁❁❁

# اسلامی نظام بذریعہ انتخابات

## مولانا مودودیؒ کے موقف میں تبدیلی

### ایک مطالعاتی تجزیہ[1]

سعادت محمود☆

برصغیر پاک و ہند میں جماعت اسلامی کے احیاء کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے لیا۔ جماعت اسلامی کے قیام کے لیے گراؤنڈ ورک ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء سے شروع کیا گیا تھا جب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے نام سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اپریل ۱۹۴۱ء میں ''ایک صالح جماعت کی ضرورت'' کے عنوان سے لوگوں کو ایک جماعت کے قیام کے لیے دعوت دی گئی۔ مولانا مودودی صاحب کی اس دعوت پر ۷۵ آدمی لاہور میں جمع ہوئے اور ''جماعت اسلامی'' کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔

جماعت اسلامی کی حکمت عملی پر تحفظات اور اُن پر تشویش تو ایک عرصے سے ہے لیکن ۱۲ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے بعد جماعت اسلامی کے امیر کے پالیسی بیانات جن میں انتخابات میں شکست کی ذِمہ داری کو تسلیم کیا گیا ہے' اس تحریر کا محرک ہیں[1]۔ وہ جماعت جو انبیاء علیہم السلام کی

☆ Saadi-edu@hotmail.com

(۱) یہ مضمون ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے حوالے سے لکھا گیا تھا' اس لیے اُس وقت کے امیر جماعت کے اعترافِ شکست کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حالیہ انتخابات ۲۰۲۴ء کے بعد موجودہ امیر صاحب نے نہ صرف شکست تسلیم کی' بلکہ شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری سے استعفا بھی دے دیا۔ حیرت ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی علم بردار اور اسلامی نظام قائم کرنے کی دعوے دار جماعت اپنی شکست تسلیم کرے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال کی دعوت کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور جو مقدمہ پیش کیا اس میں اپنی شکست کا اعتراف نہیں کیا بلکہ قوم کے انکار کا ذکر کیا۔ کتنے ہی انبیاءؑ کو اُن کی قوموں نے جھٹلا دیا' لیکن وہ نبی ناکام نہیں ہوئے بلکہ وہ قومیں ناکام ہوئیں جنہوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرایا۔



وارث تھی اور جس کا نعرہ ہے کہ قرآن وسنّت کی دعوت لے کر اٹھو اور دنیا پر چھا جاؤ' وہ آج اس مقام پر کیسے پہنچی۔ ہمارا ایمان ہے کہ انبیاء کبھی ناکام نہیں ہوتے بلکہ وہ قوم ناکام ہوتی ہے جو نبی کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

قرآن وحدیث کی رُو سے حضرت نوح علیہ السلام ناکام نہیں ہوئے جن کی نوسو سال کی دعوت کے باوجود گنتی کے چند افراد ہی ان پر ایمان لائے۔ نہ ہی حضرت یحییٰ علیہ السلام ناکام ہوئے جبکہ بادشاہ نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر اُن کا سر کاٹ کر اُس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ناکام ہوئے جن کی قوم نے وقت کے فرمان روا کے استفسار پر ان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی رہائی کے بارے میں فیصلہ دیا' اور اپنے خیال میں آپؑ کو صلیب پر چڑھا دیا تھا۔

جی ہاں جس جماعت کے امیر مولانا مودودیؒ صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر کہا تھا کہ جماعت اسلامی نہیں ہاری قوم ہاری ہے' آج اس کا امیر شکست کا اقرار کرتا ہے۔ جماعت اسلامی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اپنے نصب العین اور اس کے حصول کے طریقۂ کار سے انحراف تو تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا جو بڑھتے بڑھتے آج اس مقام پر پہنچا ہے۔ یہ انحراف ایسا نہیں ہے کہ کوئی بعد میں آنے والوں نے کیا ہو بلکہ خود جماعت اسلامی کے داعی کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ جماعت اسلامی کے موقف میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلی آئی ہے' ان سطور میں اس کا جائزہ لینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی جارہی ہے۔ مقصود صرف تنقید نہیں بلکہ خواہش اصلاح کی ہے۔ اگرچہ یہ امر بہت تکلیف دہ ہے لیکن جب تک نکتہ انحراف تک نہیں پہنچا جائے گا اور اس چیز کا تعین نہ ہوگا کہ پٹڑی کہاں سے بدلنا شروع ہوئی' گاڑی کو دوبارہ پٹڑی پر چڑھانا مشکل ہے۔ بقول شاعر ؎

اُسی مقام پہ واپس چلو تو بات بنے
کہ جس مقام پہ بھٹکا تھا کارواں اپنا

اس انحراف کی دو جہتیں ہیں۔ ایک نصب العین اور دوسرے اس کے حصول کا طریقہ کار (لائحہ عمل)۔

جماعت کا نصب العین دو اجزاء پر مشتمل ہے: عملاً اقامتِ دین جبکہ حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول۔ یہاں بھی ایک باریک نکتہ ہے۔ اقامتِ دین کو نصب العین قرار دینا

بھی درست نہیں ہے۔ اول تو خود نصب العین کی تشریح میں لکھا گیا ہے کہ:

''اگرچہ مؤمن کا اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے، مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مؤمن کا عملی نصب العین اقامتِ دین جبکہ حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامت دین کی سعی کے نتیجے میں حاصل ہوگی۔''

خود مولانا کے الفاظ میں:

''کوئی کہتا ہے کہ علو اور تمکن فی الارض کی طرف آؤ، حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے، بلکہ اپنے نصب العین (اعلائے کلمۃ اللہ) کے لیے اس کی بے غرضانہ جِدّ و جُہد کا طبعی نتیجہ ہے۔'' (تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان: حصہ اول، ص ۱۰۳)

اگر اقامتِ دین کو مقصد قرار دیا جاتا ہے تو پھر شکست تسلیم کرنا بجا ہے۔ اگر نصب العین کے الفاظ میں تھوڑی سی ترمیم کر لی جائے تو اس الجھن سے نکلا جا سکتا ہے۔ یعنی: ''اقامتِ دین کی سعی اور جِدّ و جُہد کے ذریعے رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول۔''

پہلا انحراف جماعت اسلامی کے نصب العین میں ہوا، جس کا اللہ سے ڈرتے ہوئے اور شیطان کے شر سے پناہ مانگتے ہوئے نہایت دردمندی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ فی الحال چند اشارے دیے جا رہے ہیں۔ دستور میں درج نصب العین سے حقیقی نصب العین پس منظر میں چلا گیا اور اس کی جگہ عملی نصب العین نے لے لی۔ یہی بنیادی انحراف ہے، باقی سب اسی بنیادی انحراف ہی کے نتائج ہیں۔ اس کے لیے چند حوالے دیے جا رہے ہیں۔

۱۹۵۱ء کے کل پاکستان اجتماع کے موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی تقریر ''ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں؟'' میں فرماتے ہیں:

''اب میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ہم اس ملک میں کس طرح کے تغیرات لانا چاہتے ہیں۔ اس کا اجمالی جواب تو میں آپ کو دے چکا ہوں کہ ہم اس ملک میں اسلام کو لانا چاہتے ہیں۔ خالص اسلام کو، سو فی صدی اسلام کو، زندگی کے ہر گوشہ میں اسلام کو..... الغرض ہماری تمنّا اور کوشش یہ ہے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر گوشے پر اللہ کا رنگ چڑھ جائے۔ کوئی کونہ اور گوشہ بھی صبغۃ اللہ کی تنویر سے محروم نہ رہے۔ جب تک ایک نقطہ کے برابر بھی کسی گوشہ میں ایسی جگہ باقی رہے گی جس پر اسلام کی چھاپ نہ ہوگی



اس وقت تک ہم سمجھیں گے کہ ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا اور ہم برابر اپنی کوشش جاری رکھیں گے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کے ہر گوشے پر اپنے دین کو قائم فرمائے۔''

پوری تقریر پڑھ جائیے، کہیں آپ کو حقیقی نصب العین کا ذکر نہیں ملے گا کہ یہ سب ہم کیوں چاہتے ہیں! آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس تقریر کا موضوع نہیں تھا۔

اسی اجتماع میں مولانا صاحب ''مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' میں فرماتے ہیں:

''یہ جائزہ میں نے کسی کو مطعون کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لیا ہے کہ آپ موجودہ صورت حال اور اس کے تاریخی اسباب کی اچھی طرح تشخیص کر لیں اور اس لائحہ عمل کو ٹھیک ٹھیک جانچ سکیں جو ہم نے محض اللہ کی توفیق و تائید کے اعتماد پر ان حالات میں پاکستان کی اصلاح کے لیے اور اس کو بالآخر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا علم بردار بنانے کے لیے اختیار کیا ہے ..... ان سب شرطوں کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کو نظامِ غالب بنانے کی تحریک اسی طرح ایک ہمہ گیر سیلاب کی مانند اٹھے جس طرح مغربی تہذیب یہاں سیلاب کی مانند آئی اور زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئی .....

ہم زندگی کے کسی ایک جزو یا بعض اجزاء میں کچھ اسلامی رنگ پیدا کر دینے کے قائل نہیں بلکہ اس بات کے درپے ہیں کہ پورا اسلام پوری زندگی پر حکمران ہو ..... اسلام کے اس ہمہ گیر تسلّط ہی سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان یکسو ہو کر ان روحانی، اخلاقی اور مادی فوائد سے پوری طرح متمتع ہو جو ربّ العالمین کی دی ہوئی ہدایت پر چلنے کا فطری نتیجہ ہیں۔ اور پھر اسی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ یہ ملک تمام مسلم ممالک کے لیے دعوت اِلی الخیر کا اور تمام دنیا کے لیے ہدایت کا مرکز بن جائے۔''

''جماعت اسلامی کی دعوت'' کے نام سے موجود کتابچہ پورا پڑھ لیں۔

''پہلا نکتہ: بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت، جس کا لُبِّ لُباب: ''انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور ربّ، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے اور اپنی پوری زندگی کو، خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے۔

دوسرا نکتہ: منافقت کو چھوڑنا: منافقانہ رویّہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے برخلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلّط پا کر راضی

اور مطمئن رہے اور اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے..... مخلصانہ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس طریق زندگی پر ایمان رکھتے ہوں اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں ....

تیسرا نکتہ: امامت میں تغیر: پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمۂ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دینِ حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں ..... ہماری دعوت کی طرح ہمارا طریق کار بھی دراصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے ..... اس میں ایک طرف خود کارکن کے اندر وہ گہری بصیرت، وہ سنجیدگی، وہ پختہ کاری اور وہ معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے زیادہ صبر آزما اور زیادہ محنت و حکمت چاہنے والے مراحل میں درکار ہونے والی ہے۔''

اس میں بھی اصل نصب العین کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

''جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل'' کے دیباچہ میں مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''اس مرحلے میں عام لوگ اس جماعت سے روشناس ہو رہے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جماعت کیا ہے، کس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے، اس کا نظام کس قسم کا ہے، اب تک اس نے کیا کام کس طرح کیا ہے اور اب کیا کرنا چاہتی ہے۔''

اس کے بعد کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا صاحب لکھتے ہیں:

''جماعت اسلامی جس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال، مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت، معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے''۔

یہ مقصد اول روز سے ہمارے پیش نظر رہا ہے اور آج بھی یہی ایک مقصد ہے جس کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ ہمارے پیش نظر کبھی تھا، نہ آج ہے، نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا۔ آج تک جس کام سے بھی ہم نے دلچسپی لی ہے اسی مقصد کے لیے لی ہے اور اسی حد تک لی ہے جس حد تک ہماری دانست میں اس کا تعلق اس مقصد سے تھا۔''

اس کے بعد پوری کتاب پڑھ جائیے، کہیں آپ کو حقیقی نصب العین کا ذکر نہیں ملے گا۔

اسی طرح ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل'' شروع سے آخر تک پڑھ لیں۔ چھ گھنٹے کی اس پوری تقریر کا محور تبدیلیٔ قیادت اور اس کے لیے لائحۂ عمل پر مبنی ہے۔ حقیقی نصب العین کا



تذکرہ تک نہیں ہے۔ اللہ کی نصرت، اس سے دعا، اس سے اجر کی توقع، اس کا ذکر، کسی چیز کا تذکرہ نہیں ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش کیا ہے، وہاں فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾ (الاحزاب)

''بے شک اللہ کے رسولؐ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے (ان لوگوں کے لیے) جو اللہ سے اُمید رکھیں، آخرت کی امید رکھیں اور اللہ کا ذکر کثرت سے کریں۔''

قرآن اور حدیث کی روشنی میں دیکھیں تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا زور آخرت پر ہے۔ سورۃ الصف میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿١٠﴾﴾ (الصف)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے نجات دلا دے۔''

سورۃ التوبہ میں واضح کیا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ﴾ (آیت ۱۱۱)

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

سورۂ آلِ عمران میں ترغیب دلائی گئی:

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (آیت ۱۳۳)

''دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنّت کی طرف جس کی وسعتیں آسمانوں اور زمین کی طرح ہیں۔''

سورۃ الحدید میں فرمایا گیا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (آیت ۲۱)

''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنّت کی

طرف جس کی وسعتیں آسمانوں اور زمین کی مانند ہیں۔‘‘

اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ تم ایک آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے ہو اور اس میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں۔

حضرت حنظلہ ؓ سے مروی حدیث جو اکثر نفاق کے ضمن میں بیان کی جاتی ہے اس میں حضرت حنظلہؓ کے الفاظ پر غور کریں کہ وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول ﷺ جب آپ ہمیں جنت اور دوزخ کا ذکر کر کے نصیحت کر رہے ہوتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ہم جنّت اور دوزخ کو سامنے دیکھ رہے ہیں۔ گویا کہ حضور ﷺ کی محفل میں جنت اور دوزخ کا اتنا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں یہاں صورت حال دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے!

یہ تو صورتِ حال تھی حقیقی نصب العین کی۔ حقیقی موضوع تو یہی ہے جس پر تفصیلی گفتگو ہونی چاہیے لیکن اس تحریر کو شروع کرنے کا محرک عملی نصب العین کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے لائحہ عمل میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا تھا‘ اس لیے فی الوقت اسی پر گفتگو کریں گے۔

موازنے کے لیے مولانا مودودی صاحب کی اپنی تحریروں سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ پہلے تین نکات پر مشتمل وہ موقف ہے جو ابتدا میں تھا اور صحیح موقف تھا۔ اس کے بعد چھ نکات پر مشتمل تبدیل شدہ موقف کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ پھر ان نکات کا دو پہلوؤں سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش ہے کہ جب مولانا صاحب نے اس بدلے ہوئے موقف کی توجیہہ کی۔ آخر میں مولانا صاحب کے تین مختلف معاملات پر ایک دوسرے سے بالکل متضاد موقف پیش کیے گئے‘ جن کا تعلق اصلاً اپنے بنیادی موقف میں تبدیلی سے ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے‘ یہ انحراف مولانا مودودیؒ صاحب کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ بات ان کے عقیدت مندوں پر گراں گزرے گی لیکن میں اور آپ حقیقت کو تو بدل نہیں سکتے۔ مولانا صاحب کا مقام اپنی جگہ مسلّم ہے۔ وہ اپنی کاوشیں کر کے اللہ کے حضور پہنچ چکے اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ انہیں اپنے مقرّب بندوں میں شامل کرے گا!

اندھی تقلید سے اجتناب ہمیں مولانا ہی نے سکھایا ہے۔ دوسرے یہ کہ مولانا صاحب بھی



انسان تھے اور تدبیر کی غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔

اس دنیا میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگ اس بات کی گواہی دینے کے لیے موجود ہیں کہ انہوں نے مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے ذریعے ہدایت پائی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی ؓ سے فرمایا تھا کہ اگر تمہارے ذریعے ایک آدمی بھی ہدایت پا جائے تو یہ بات تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ خود مَیں بھی اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ پہلی دفعہ ’’دینیات‘‘ پڑھنے کے بعد دل سے کلمہ شہادت نکلا تھا۔ ’’خطبات‘‘ نے عمل پر آمادہ کیا۔ ’’تفہیم القرآن‘‘ نے پوری دُنیا میں لوگوں کو متاثر کیا۔ مولانا صاحب کی کتابوں سے متاثر ہونے والوں کے واقعات بہت ہیں۔ اس لیے اس تجزیے سے مولانا کی شخصیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اس صورتحال پر آپ بھی غور کریں۔ میں نے تو غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ کی مشیت یہی تھی۔ حضرت یوسف ؑ کے قصّہ میں‘ جسے اللہ نے خود بہترین قصّہ قرار دیا ہے‘ قیدی کے خواب کی تعبیر میں حضرت یوسف ؑ نے کہا تھا کہ تم رہا کر دیے جاؤ گے اور اپنے آقا کو شراب پلاؤ گے تو اپنے آقا کے سامنے میرا معاملہ بھی رکھنا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اسے بھلا دیا۔ روایات کے مطابق حضرت یوسف ؑ اس کے بعد بارہ سال جیل میں رہے۔ اب اس کی مصلحت اللہ کے سوا کون جان سکتا ہے!

## ابتدائی موقف

(۱) ’’جو لوگ اجتماعیت میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خواہ حکومت کسی نوعیت کی ہو‘ مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اس کو کسی اور جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی‘ نفسیاتی‘ تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے .....اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف ان حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے ..... دراصل مَیں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اس کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے‘ اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں‘ اسی

طرح کا اجتماعی اخلاق بنے‘ اسی طرز کی لیڈرشپ ہو اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اس خاص نظام حکومت کی فطرت کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور ایک طویل مدّت تک جدّ و جُہد کرنے سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظامِ حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر کر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جِدّ و جُہد کی ہو ..... جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں‘ کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری‘ اخلاقی‘ تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں‘ ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے .....

درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات‘ وہ مقصد زندگی‘ وہ معیارِ اخلاق‘ وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے ..... اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدّ و جُہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدو جہد میں اس کے علم بردار مصیبتیں اٹھا کر‘ سختیاں جھیل کر‘ قربانیاں دے کر‘ مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا جانچ کر بے کھوٹ کامل المعیار سونا ہی پائے ..... اس طرح کی جدو جہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے‘ اس تحریک میں کھنچ کر چلے آئیں گے ..... عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو گا‘ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی ..... آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظامِ حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔ یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز کا ہی سہی‘ مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی ریاست (اسٹیٹ) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ‘ سیاسیات



اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر اس کو ناممکن سمجھتا ہوں‘ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں‘ حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو‘ کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا ..... عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا فرماں روا جس کی پشت پر تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی‘ اس معاملے میں قطعی ناکام ہو چکا ہے کیوں کہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہیں تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں بلکہ صرف اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا‘ اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ (یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت مسلمانوں کی مجموعی اخلاقی حالت بھی اتنی بگڑی ہوئی نہیں تھی جتنی اس وقت تھی جب کہ یہ سطور لکھی گئی تھیں) اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں کس طرح مددگار ہو سکتا ہے! جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے‘ اگر وہ صحیح اسلامی سیرت و کردار کے عاشق نہیں ہیں‘ اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی ''مسلمان'' آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں جا سکتے۔ اس ذریعے سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں‘ مگر اپنے نظریات اور طریقہ کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر ایک غیر مسلم حکومت میں تھے‘ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر‘ کیونکہ وہ ''قومی حکومت'' جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو گا‘ انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہو گی جتنی ایک غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ ''مسلم قومی حکومت'' ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی‘ اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ

علیہ ہی رہیں گے۔

پس یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس قسم کی ''قومی حکومت'' کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی' اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر' بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد ''مسلم حکومت'' کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف یہ کہ غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّراہ ثابت ہوگی۔''

[ستمبر ۱۹۴۰ء۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان' حصہ دوم) صفحہ ۱۶۲' ۱۷۰' ۱۷۱' ۱۷۶]

(ب) ''ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خودمختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت ربّ العالمین کے قیام میں مددگار ہوسکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے ویسی ہی بلکہ عددی حیثیت میں بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان' ترکی اور مصر میں موجود ہے۔ وہاں اس (مسلم اکثریت) کو وہ ''پاکستان'' حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خودمختار حکومت کسی بھی درجہ میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار' میں پوچھتا ہوں' کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ جب صورت حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی ان آزاد حکومتوں کے سدِّراہ ہونے کا سبب کیا ہے! اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کریں گے' جواب اس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ در اصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے جبکہ نظریہ حیات و مقصد زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی بھی نصیب



ہو جائے' اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو' تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق وصداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی' بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراضِ دُنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے' وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہوں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخابات میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاجِ نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا' قدرتی بات ہے کہ وہ اس دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلّط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی' ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی .....

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کر کے' ان کے نقطہ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کی نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کو برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ' اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کی بجائے الٹا اس کی مزاحمت کریں گے ..... یہی نہیں' اس سے زیادہ خوف ناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت اور بے باکی کے

ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟''

[جنوری ۱۹۴۱ء۔ اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں (تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان: حصہ دوم) صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲]

(ج) ''وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جا رہا ہے (.....) تو ہم دل وجان سے اس کے حامی ہوں گے، اور اگر وہ نظام غیر اسلامی ہوا تو ہم اسے تبدیل کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔''

[جولائی ۱۹۴۷ء۔ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصہ اول، صفحہ ۲۴۔ بحوالہ رسائل و مسائل، حصہ اول، صفحہ ۳۶۳]

## دوسرا موقف

(الف) ''بلاشبہ ایسی حالت میں جب کہ غیر اسلامی اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اس حالت کی نسبت جب کہ فاسد سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے، لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اصولی طریق کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے چلے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عامہ کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھ میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصولوں پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔'' [ستمبر/اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ اسلامی ریاست، صفحہ ۷۱۵]

(ب) ''حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کو قبول کر لینے سے حضرت یوسفؑ کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام



کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی جاتی تو آپؐ بھی اسے قبول کر لیتے اور خوامخواہ لڑ کر وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کبھی ہم کو بھی اگر یہ توقع ہو جائے کہ ہم رائے عامہ کی تائید سے نظامِ حکومت پر اس طرح سے قابض ہو سکیں گے اور اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اسے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی، جمہوری ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عامہ کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور تبدیل کر سکیں گے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خوامخواہ ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ طریق کار ہم صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:

اولاً: ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عامہ کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً: ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی ایک بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں، اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً: انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔''

[ستمبر/اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ اسلامی ریاست، صفحہ ۷۱۱]

(ج) ''اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کر دیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔''

[۱۹۴۷ء تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، حصہ اول، صفحہ ۲۵ بحوالہ ''جماعت اسلامی کی دعوت'']

(د) ''ریڈیو پاکستان سے ایک انٹرویو یا مباحثے میں سائل کا سوال اور اس کا جواب

سائل: میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج' اخلاق' عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پَرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی .....اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔

جواب: آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پَرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پَرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے باشندوں میں اسلامی شعور' اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصّہ لینے سے آپ ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں .....اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ: آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصّہ لے گی جو ایک معمار کا حصّہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرزِ عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے' اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہوگئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا



جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔''

[مئی ۱۹۴۸ء۔ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان' حصّہ دوم' صفحہ: ۳۳۳' ۳۳۵]

(ھ) ''واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص ہوں اور اپنے وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو صلاحیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام کی تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں۔ پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے۔ پھر نئے انتخاب ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دی جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جِدّ و جُہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہوگا جو قیامِ پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ

ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔

اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔'' [ستمبر ۱۹۴۸ء'اسلامی ریاست' صفحہ:۷۱۷۔۷۱۸]

(و) قراردادِ مقاصد (منظور ہو جانے) کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں جماعت نے یہ طے کر دیا تھا کہ اب قانون ساز اسمبلیوں کی رکنیت اور ان کے انتخابات میں حصہ لینا جائز ہو گیا ہے..... چنانچہ پنجاب کے انتخاباتِ عام کا اعلان ہو جانے کے بعد جماعت کی مجلسِ شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۵ تا ۹ ستمبر میں ان انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور پروگرام یہ طے کیا کہ اس بارے میں قدمِ اوّل کے طور پر عوام میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ پاکستان کے استحکام اور بقا کے لیے ناگزیر ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اسلامی نظام کے قیام کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ نظامِ حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن کے اخلاق اور سیرتیں قابلِ اعتماد ہوں، جو اسلام کو جانتے ہوں، اس کو مانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق پاکستان کی تعمیر کی قابلیت اور عزم بھی رکھتے ہوں۔

(ز) ''لہٰذا اگر ہم فی الواقع اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو فسق و ضلالت کی راہ سے ہٹا کر دینِ حق کی صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ بگاڑ کو مسندِ اقتدار سے ہٹانے اور بناؤ کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی براہِ راست کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اگر اہلِ خیر و اصلاح کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ تعلیم اور قانون اور نظم و نسق کی پالیسی کو تبدیل کر کے چند سال کے اندر وہ کچھ کر ڈالیں گے جو غیر سیاسی تدبیروں سے ایک صدی میں بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے؟ ایک جمہوری نظام میں اس کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ ہے انتخابی جِدّ وجُہد۔ رائے عامہ کی تربیت کی جائے، عوام الناس کے معیارِ انتخاب کو بدلا جائے، انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کی جائے اور پھر ایسے صالح لوگوں کو اقتدار کے مقام پر پہنچایا جائے جو ملک کے نظام کو خالص اسلام کی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں اور قابلیت بھی۔''

[۱۹۵۱ء۔ مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل' روداد جماعت اسلامی' حصہ ششم' ص ۴۰۹]

(جاری ہے)

❁❁❁





# ایک فکر انگیز پکار!

سید ابوالحسن علی ندویؒ

اے مسلمانو! کیا تم سنتے ہو؟

مغرب کی درس گاہوں، تحقیقاتی اداروں اور علمی مرکزوں سے مسلسل ایک آواز ہم سے مخاطب ہے، مگر افسوس کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا، کسی کا خون جوش نہیں مارتا اور کسی کی غیرت نہیں جاگتی۔ یہ آواز کہتی ہے:

اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو! سنو!
تمہارے اقبال کے دن گزر گئے،
تمہارے علم کے کنویں سوکھ گئے
اور تمہارے اقتدار کا سورج ڈوب گیا۔

اب تمہیں حکمرانی اور سلطانی سے کیا واسطہ؟ تمہارے بازو اب شل ہو گئے اور تمہاری تلواریں زنگ آلود۔ اب ہم تمہارے آقا ہیں اور تم سب ہمارے غلام ہو۔

دیکھو! ہم نے سر سے پاؤں تک کیسا تمہیں اپنی غلامی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ہمارا لباس پہن کر اور ہماری زبان بول کر اور ہمارے طور طریقے اختیار کر کے تمہارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جب ہمارا قومی نشان اور مذہبی شعار ٹائی لگا کر اسکول جاتے ہیں تو اس لباس کو دیکھ کر کیسا تمہارا دل خوش ہوتا ہے!

ہم بے وقوف نہیں تھے۔ پہلے ہم نے تمہارے دل و دماغ کو اپنا غلام بنایا۔ اب تم ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہو، ہمارے کانوں سے سنتے ہو اور ہمارے دماغ سے سوچتے ہو۔ اب تمہارے وجود میں تمہارا اپنا کچھ نہیں۔

اب تم ہر شعبہ زندگی میں ہمارے محتاج ہو۔ تمہارے گھروں میں ہمارے طور طریقے ہیں۔ تمہارے دماغوں میں ہمارے افکار ہیں۔ تمہارے اسکولوں اور کالجوں میں ہمارا مرتب کیا

ہوا نصاب ہے۔ تمہارے بازاروں میں ہمارا سامان ہے اور تمہاری جیبوں میں ہمارا سکّہ ہے۔ تمہارے سکّے کو ہم پہلے ہی مٹّی کر چکے ہیں۔

تم ہمارے حکم سے کیسے سرتابی کر سکتے ہو؟ تم ہمارے اربوں اور کھربوں روپے کے قرض دار ہو۔ تمہاری معیشت ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہاری منڈیاں ہمارے رحم و کرم پر ہیں اور تمہارے سارے تجارتی ادارے صبح اٹھتے ہی ہمارے سکے کو سلام کرتے ہیں۔ تمہیں اپنے جوانوں پر بڑا ناز تھا۔ تم کہتے تھے ع ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!''

تو سنو! اس زرخیز زمین کو ہم نے ہیروئن بھرے سگریٹ، شہوت انگیز تصویروں، زنا کے ہیجان خیز مناظر سے لبریز فلموں اور ہوسِ زر کا آبِ شور شامل کر کے بنجر کر دیا ہے۔

تمہیں اپنی افواج پر بھی بڑا گھمنڈ تھا۔ اب جاؤ! اپنی فوج کے اسلحہ خانوں کو دیکھو۔ اگر ہم ہاتھ روک لیں تو تمہارا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اب تم بغیر ہم سے اجازت لیے کسی پر فوج کشی نہیں کر سکتے۔ بوسنیا اور عراق کے حشر کو ہمیشہ یاد رکھنا۔

جاؤ! اب عافیت اسی میں ہے کہ جو طرزِ حیات اور طرزِ حکومت ہم نے تمہیں سکھایا ہے، اس سے سرمو انحراف نہ کرنا۔ خبردار! ہماری غلامی سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمیں امید بھی یہی ہے کہ تم برسوں تک ایسا نہ کر سکو گے، کیونکہ اس کوشش کے جتنے محرکات ہو سکتے تھے یعنی ایمان کی پختگی، جوشِ جہاد، بالغ نظری، غیرتِ دین وہ سب ہم نے تمہارے دانشوروں، مفکّروں اور عالموں سے دنیا کی چند آسائشی چیزیں دے کر خرید لیے ہیں۔

ہم نے تمہاری عورتوں کو ٹی وی کے ذریعے بے حیائی کی ترغیب دے کر، سنگھار و آرائش حسن کا بہترین سامان دے کر ان کی چادر اتروا دی ہے اور تمہارے مَردوں کو عریاں اور فحش فلمیں دکھا کر ان کی مردانگی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اب تمہارے یہاں کوئی خالد، کوئی طارق، کوئی صلاح الدین اور کوئی ٹیپو پیدا نہیں ہو سکتا۔

اور سنو! ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ تمہاری قوم کے کچھ احسان بھی ہم پر ہیں۔ خاص طور پر تمہارے علماء کے، جنہوں نے اپنی مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی تکفیر کر کے آپس میں لڑ لڑ کر ہماری تہذیب و افکار کے لیے راستہ صاف کیا۔ تمہارے دانشوروں اور مفکّروں نے ترقی یافتہ اور ماڈرن کہلانے کے شوق میں ملحد اور زندیق بن کر ہمارے فلسفے کی



اشاعت کی۔ تمہاری تعلیم گاہوں نے ہمارا نصاب تمہارے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ہم سے بہتر طریقے سے اتار کر اپنے مذہب سے بغاوت پر اُکسایا۔ تمہارے صاحبانِ اقتدار اپنے سارے وسائل تمہیں بے حیا، بے غیرت اور بے دین، بنیاد پرست اور دہشت گرد بنانے کے لیے ہمارے ہی اشاروں پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔

تمہارے مذہب نے کیسی کیسی پابندیاں تم پر لگا رکھی تھیں۔ یہ حرام وہ حرام، یہ جائز وہ ناجائز۔ زندگی کی راہیں تم پر تنگ کر دی تھیں۔ ہم نے تمہیں زندگی کا ایک نیا راستہ دکھایا اور تمہیں حرام و حلال کی قید سے آزاد کر دیا۔ کیا تم اس پر ہمارا شکر ادا نہ کرو گے؟

اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو!

کیا تم سنتے ہو؟؟

(ماخوذ: مغربی ثقافت اور ملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب)

❁ ❁ ❁

## قارئین توجّہ فرمائیں!

''میثاق'' میں شامل ایسے مضامین جن کے مصنّفین/مرتّبین کا تعلق ہمارے ادارے سے نہیں ہے، انہیں قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ اشاعت سے قبل ان میں لسانی، واقعاتی اور زمانی اعتبارات سے ممکنہ حد تک اصلاح بھی کی جاتی ہے۔ تاہم تحریر کے انداز، اس میں دی گئی تفصیلات اور اسے مرتّب کرنے کے مقصد کے حوالے سے سوالات/اعتراضات کا جواب دینے کی ذمہ داری ادارے پر عائد نہیں ہوتی۔ ایسے مصنّفین کی آراء سے ادارے کا مکمل طور پر اتفاق بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ اس ضمن میں صاحبِ تحریر ہی سے رجوع کیا جانا چاہیے، جس کا فون نمبر/ای میل/پتہ وغیرہ تحریر کے آغاز میں دے دیا جاتا ہے۔ شکریہ!

Apr. 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.4

Monthly Meesaq Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

# کلیۃ القرآن (قرآن کالج) لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھیں
اور دوسروں کو قرآن سکھائیں۔“ (حدیث نبویؐ)

درس نظامی (درجہ اولیٰ تا دورہ حدیث) مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے

## داخلے شروع

**اہلیت:** مڈل پاس طلبہ

پہلے آیئے پہلے پایئے

**خصوصیات**

- ذہین طلبہ کے لیے وظائف
- انتہائی کم فیس
- ہاسٹل کی محدود سہولت موجود
- دینی ماحول میں اعلیٰ تعلیمی معیار
- تجربہ کار اور محنتی اساتذہ
- حفاظ کے لیے فری ایجوکیشن پیکج

ایڈمیشن آفس
191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

**برائے معلومات**
دفتری اوقات کے دوران 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد 0302-4471171

المعلن
حافظ عاطف وحید، مہتمم
ریاض اسماعیل، پرنسپل